بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

11

غزل نمبر

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

رابطہ کیلئے

P.O.Box:210871, Milwaukee Wi 53221, USA.
Phone:+414-350-5594, +414-943-5594
E-mail:adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

زیرِ اہتمام

فسٹ سٹیپ پبلی کیشنز، امریکہ

First Step Publications, U.S.A.

ناشر

محمد عابد

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان

Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221

E-mail:misaalpb@gmail.com

قیمت: 200 روپے

ترتیب

آغا نثار ۷
آفتاب احمد ۸
ابرار احمد ۱۰
احمد امتیاز ۱۱
احمد خیال ۱۳
احمد سلیم رفی ۱۴
احمد شہباز خاور ۱۵
اختر رضا سلیمی ۱۶
ارشاد جالندھری ۱۷
اشرف سہیل ۱۸
اشرف یوسفی ۱۹
اصغر علی بلوچ ۲۰
افتخار شفیع ۲۱
افضل حمید ۲۲
اقبال اختر ۲۳
امجد شیخ ۲۵
انیل چوہان ۲۶
بیدل حیدری ۲۷
پارس کاسگنجوی ۲۹
پرویز ساحر ۳۰
تنویر شاہد محمد زئی ۳۱
جانِ عالم ۳۲
جلیل عالی ۳۳
جواد شیخ ۳۴
حسن عباسی ۳۵
حماد نیازی ۳۷
حیدر قریشی ۳۸
خالد ملک ساحل ۳۹
خاور جیلانی ۴۱
خلیق الرحمٰن ۴۳
خورشید ربانی ۴۴
دانیال طریر ۴۵
ڈاکٹر آصف مغل ۴۶
ذرّہ حیدر آبادی ۴۷
راشد اقبال ۴۸
راشد حسین ۴۹
راؤ وحید اسد ۵۰
رضیہ کاظمی ۵۱
رُستم نامی ۵۲
سجاد حیدر ۵۳
سرور اَرمان ۵۵
سعد اللہ شاہ ۵۷
سعید احمد اختر ۵۸
سلیم شہزاد ۵۹
سلیمان جاذب ۶۰
سمیع صدیقی ۶۱
سہیل عباس ۶۲
سیّد اذلان شاہ ۶۴

سیّد گلزار بخاری ۶۵
شاہین عباس ۶۶
شفیق آصف ۶۷
شکور الرحمٰن فقیرؔ ۶۸
شکیل جاذب ۶۹
شکیل سروش ۷۰
شناور اسحاق ۷۱
شہاب صفدر ۷۲
شہزاد نیر ۷۳
شہزاد احمد ۷۴
شیخ اعجاز ۷۵
صابر ظفر ۷۶
صابر ملک ۷۸
صبیحہ صبا ۷۹
صفدر صدیق رضی ۸۰
صفی حسن ۸۱
صلاح الدین ناصر ۸۳
ضیاء پرویز ۸۴
ضیاء حسین ضیاء ۸۵
طارق نعیم ۸۷
طارق ہاشمی ۸۸
طالب حسین کوثری ۸۹
طاہرہ صفی ۹۰
ظفر اقبال ۹۱
ظفر عجمی ۹۳
عادِل یزدانی ۹۵
عارف حسین عارف ۹۶
عطا تراب ۹۷
علی اعظم شاہ ۹۸
علی نقی خان ۹۹
عمران شناور ۱۰۰
غائر عالم ۱۰۱
غزالی ۱۰۲
غلام شبیر اسد ۱۰۳
قمر رضا شہزاد ۱۰۴
کاشف نعمانی ۱۰۵
کامی شاہ ۱۰۷
گستاخ بخاری ۱۰۸
گل بخشالوی ۱۰۹
گلفام نقوی ۱۱۰
لیاقت علی عہدؔ ۱۱۱
مامون ایمن ۱۱۲
مبارک اکمل گیلانی ۱۱۳
محبوب الٰہی عطا ۱۱۴
محمد حنیف ۱۱۵
محمد سفیان سفی ۱۱۶
محمد ضیاء اللہ قریشی ۱۱۷
محمد مظہر نیازی ۱۱۸
محمد منصور آفاق ۱۱۹
محمود عامر ۱۲۰
مقصود وفا ۱۲۱
ناز فاطمہ ۱۲۳
نصرت صدیقی ۱۲۴
نوید سروش ۱۲۵

اداریہ

ادب وثقافت کا گیارہواں شمارہ ''غزل نمبر'' کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔غزل، اُردوادب کی دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ خوش بخت واقع ہوئی ہے کہ اِسے تخلیقی سطح پر ہر دَور، ہر عہد میں نہایت باکمال سخنوران میسر آئے ہیں۔اس ضمن میں اس نکتے سے شاید ہی کوئی اِختلاف کر سکے کہ اُردوادب کی موجودہ ثروت مندی زیادہ تر بخششِ دامانِ غزل ہی کی مرہون ہے۔

غزل کے فکری رُجحانات کا ارتقا مجموعی حوالہ سے اُردوادب کی جو شباہت اُجاگر کرتا چلا جارہا ہے۔۔۔اُس شباہت کی نظر فروز آشنائی ہی درحقیقت ''ادب وثقافت'' کے اِس خصوصی ''غزل نمبر'' کی اشاعت کا مُدّعا، مقصد و جواز ہے۔

یہ شمارہ آپ کی نذر کرتے ہوئے ''انتخابِ غزل'' اور ''غزل نمبر'' کی مروج اِصطلاحات کے تناظر میں یہ اَمر وضاحت کر دیا جانا مناسب ہوگا کہ ادب وثقافت کے غزل نمبر سے موسوم موجودہ شمارہ کو ''انتخابِ غزل'' خیال نہ کیا جائے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شمارہ ہذا کی ترتیب وتدوین میں کسی نوع کی بصیرتِ انتخاب استعمال میں لائے جانے کے بجائے۔۔۔ماسوائے چند ایک استثنیات کے، سخنورانِ غزل کی طرف سے موصولہ غیر مطبوعہ کلام پر انحصار روا رکھا گیا ہے۔۔۔

یوں بھی اس مختصر وقت میں کہ جو ''ادب وثقافت'' کے زیرِ نظر شمارے کو طباعتی وجود میں آنے کے لیے میسر تھا، ممکن ہی کہاں تھا کہ صنفِ غزل کے کسی اعلیٰ، جامع اور مبسوط انتخاب کا بیڑا اُٹھایا جا سکتا۔۔۔گویا جہاں یہ غزل نمبر تازہ غزل کے باب میں اپنے قارئین کو ذوق آشنائی کے مواقع فراہم کرے گا وہیں اس اَمر کا اثبات بھی کرے گا کہ۔۔۔اس ''غزل نمبر'' میں موجود مواد شعری معیارات کے اعتبار سے۔۔۔مطبوعہ منتخب کلام کے اعتبارات کی مطابقت پانے کا ہر لحاظ سے اہل ہے۔۔۔

''غزل نمبر'' کی اس اشاعت پر اظہارِ اطمینان اپنی جگہ۔۔۔لیکن جدید غزل کے بعض بہت

اہم، سر وقد، معتبر اور محترم شعرا کے کلام کا بر وقت عدم دستیابی کی بنا پر اس شمارے میں اُن کی تخلیقی نمائندگی نہ کر پانے کا افسوس رہے گا۔۔۔

مزید برآں۔۔۔''غزل نمبر'' کے لیے وقتِ مقررہ تک موصول شدہ تخلیقات کا غالب حصہ شاملِ اشاعت کر لیا گیا ہے جب کہ بقیہ آئندہ شمارہ جات کی زیب و زینت بڑھانے کے لیے کام میں لایا جائے گا۔۔۔اپنی محدوداتِ عمل و طباعتی حوالے سے درپیش معاملات کو زیبِ داستان کیے بغیر اُمید کرتے ہیں کہ ''ادب و ثقافت'' کا یہ شمارہ اس قابل ضرور ہوگا کہ تشنہ لبانِ ذوق کو غزل کے نو بہ نو پھوٹتے چشموں تک بہ سہولت رسائی بہم پہنچا سکے۔

اس غزل نمبر سے اگر تحسین کا کوئی پہلو برآمد ہو تو اس کی داد مثال پبلشرز کے کار پردازان خاور جیلانی اور محمد عابد کو بھی ضرور ملنی چاہیے کہ اُن کے اخلاصِ کار اور پیشہ ورانہ معاونت کے بغیر شاید یہ سب کچھ بر وقت ممکن نہ ہو پاتا۔ادب و ثقافت کے اس غزل نمبر پر ہمیں آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مدیران

آغا نثار

جب زہر کا کسی کو پیالہ دیا گیا
سقراط کا یا میرا حوالہ دیا گیا

کیا کیا نہ یاد آئے تھے ہجرت کے دُکھ مجھے
جب پنچھیوں کو دیس نکالا دیا گیا

توڑا ہزار بار شبوں کے غرور کو
جگنو سے جب تلک بھی اُجالا دیا گیا

نیزے میں میرا جسم پرونے کے واسطے
مجھ کو فلک کی سمت اُچھالا دیا گیا

دیمک زدہ زبانیں ہوس کے اسیر لوگ
مجھ کو تو عہد فن بھی نرالا دیا گیا

شاید میں شہر کا نہیں جنگل کا ہوں مکیں
تلوار دی گئی مجھے بھالا دیا گیا

صحرا تمہاری آنکھ میں کیوں نقش ہو گئے
تم کو تو شہر چاہنے والا دیا گیا

اِک دُکھ کی پرورش کے لیے عمر بھر نثارؔ
اِیندھن بدن کا، خوں کا نوالہ دیا گیا

آفتاب احمد

سمجھ کر گردشِ دوراں کا چارا ، رکھ لیا تھا | جلو میں ایک آنسو اِک ستارا رکھ لیا تھا
نہ جانے کوزہ گر کے ذہن میں کیا شکل اُبھری تھی | کہ اُس نے چاک پر میرا بھی گارا رکھ لیا تھا
مرے بازو مرے پتوار جس دم بن گئے تھے | سمجھ لو میں نے کشتی میں کنارا رکھ لیا تھا
یقیناً اب بھی تھا میں اس کے اِستعمال کے قابل | کہ اس نے پھینک کر مجھ کو دوبارہ رکھ لیا تھا
سفر تھا ہجر کا زادِ سفر میں احتیاطاً ہی | جو پل تھا تیری قربت میں گزارا رکھ لیا تھا

بڑی مشکل سے پہنچا ہوں تری دہلیز تک احمؔد
مجھے اِک شہر نے سارے کا سارا رکھ لیا تھا

ooo

اُجڑے ہوئے اِک خواب کی تعبیر اُٹھا لوں | جلتے ہوئے گھر سے تری تصویر اُٹھا لوں
رکھ لوں غم و آلام بھی زنبیلِ سفر میں | جینا ہے تو پھر جینے کی تدبیر اُٹھا لوں
اِس بات پہ بھونچال تو ناراض نہ ہو گا | ملبے سے اگر حسرتِ تعمیر اُٹھا لوں
ممکن ہے مُکر جائے کوئی عہدِ وفا سے | اُس ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر اُٹھا لوں
مٹی ہوں مرے کام کا پانی ہے نہ آتش | مٹی ہی رہے گی مجھے اکسیر ، اُٹھا لوں
دَر دَر کی جبیں سائی سے رُسوائی ملے گی | بہتر ہے کہ میں تہمتِ تکفیر اُٹھا لوں
کب تک میں تجھے خود سے یونہی باندھ کے رکھوں | میرے ہو تو پھر حلقۂ زنجیر اُٹھا لوں

عجلت میں کئی کام بگڑ جاتے ہیں احمؔد
اچھا ہے کہ کچھ کرنے میں تاخیر اُٹھا لوں

ooo

کسی پاتال میں جھانکیں کہاں تک | ہمارا ساتھ دیں آنکھیں کہاں تک
اگر پہنوں نہ عریانی بدن پر | ترے ملبوس تن ڈھانکیں کہاں تک

تحیّر میں ہیں چرواہے ہمارے کہ اِس ریوڑ کو اَب ہانکیں کہاں تک
تری یادیں مسلسل چیختی ہیں سرِ دیوارِ دِل ٹانکیں کہاں تک
وہ اپنا ہے تو پھر اپنا لگے بھی فقط اِترا کے بڑ ہانکیں کہاں تک
محبت زہر بھی ہے زندگی بھی
مگر یہ زہر بھی پھانکیں کہاں تک

OOO

جام و سبو سے جونہی کھنک پھوٹنے لگی اک روشنی سی تا بہ فلک پھوٹنے لگی
چہرے پہ اُس کے اُترے کچھ ایسے حیا کے رنگ آنچل کی سلوٹوں میں دھنک پھوٹنے لگی
جگنو ذرا سی دیر کو آیا تھا ہاتھ میں میری ہتھیلیوں سے چمک پھوٹنے لگی
زخموں کا میرے اُس نے مداوا تو کر دیا میرے دُکھوں سے پھر بھی کسک پھوٹنے لگی
سوکھے شجر کو چُھو کے جو گزری گھٹا تو پھر شاخوں سے زندگی کی مہک پھوٹنے لگی
کس رہ کو اختیار کروں کس طرف چلوں دو راستوں میں ، اب تو سڑک پھوٹنے لگی
ساون وہ بارشیں وہ ترا ساتھ ، فصلِ گُل کیا پیڑ ، خشک چوب تلک پھوٹنے لگی
گھونگھٹ عروسِ شب کا اُٹھایا جب آفتابؔ
فوراً ہی صبحِ نو کی جھلک پھوٹنے لگی

OOO

خبر نہیں مجھے فکرِ معاش لے آئی یا تیرے شہر میں تیری تلاش لے آئی
غموں کے پھولنے پھلنے کے دِن نہیں تھے مگر ہزار زخم ذرا سی خراش لے آئی
مجھے تراشنے تھے کچھ خطوط اور خوشبو کہیں سے تیرے بدن کی تراش لے آئی
تری طلب مجھے لائی تو ہے ترے دَر تک اگرچہ کر کے بہت پاش پاش لے آئی
میں جس کی آب و ہوا سے تھا سہم کر نکلا اُسی مقام پہ پھر بُود و باش لے آئی
وہ آفتابؔ نہیں ہے تو رکھ کے کاندھے پر
یہ شام کس کی لہو رنگ لاش لے آئی

OOO

ابراراحمد

دہر میں یوں تو کیا نہیں موجود — پھر بھی وہ لطف سا نہیں موجود
جو میسر رہا ، غنیمت تھا — جو میسر رہا ، نہیں موجود
یادِ یاراں کا داغ جلتا ہے — اور کوئی دِیا نہیں موجود
اس خمارِ طلب میں کھلتا نہیں — کیا ہے موجود ، کیا نہیں موجود
پہلے اذنِ کلام غائب تھا — اور اب مُدّعا نہیں موجود
دو گھڑی تم ہو ، دو گھڑی ہم ہیں — کوئی ہم میں سدا نہیں موجود
اب یہیں خاک ہو رہیں گے ہم — اب کوئی راستا نہیں موجود
اے غبارِ رہِ طلبگاراں! — کہیں اس کا پتا نہیں موجود
ہم نے مانگا نہیں ہے جب کچھ بھی — پھر ہمیں کیا ، کہ کیا نہیں موجود
ہم پہ اے دوست ہاتھ رکھ اپنا — ہم میں اب حوصلہ نہیں موجود

OOO

نشۂ قرب سے سرشار کرے گا اِک روز — وہ مجھے خواب سے بیدار کرے گا اِک روز
وہ جو آئے گا ہمیں رہ پہ لگانے کے لیے — راہ کچھ اور بھی دُشوار کرے گا اِک روز
اِک وہ قصہ کہ نہیں جس سے ہمیں ربط کوئی — ہم کو رُسوا ، سرِ بازار کرے گا اِک روز
ہم نہیں ہیں ، یونہی منہ پھیر کے جانے والے — دیکھ تُو ہم کو گنہ گار کرے گا اِک روز
عکسِ منزل سے وہ بھر دے گا یہ آنکھیں میری — پھر مری راہ کو دیوار کرے گا اِک روز
وسعتِ دِل میں کہیں آگ سی جل اُٹھے گی — چاند اس دشت کو پھر پار کرے گا ، اِک روز
خوابِ خوش رنگ ، شب و روز کی بے کیفی میں — ہم کو پھر تیرا طلب گار کرے گا ، اِک روز
کھو کے رہ جائے گا آنکھوں میں ہر اِک رنگِ نشاط — دِل ترے غم سے بھی اِنکار کرے گا، اِک روز

وہ خوشی ہے کہ رُلائے گی ہمیں آخرِکار
وہم ایسا ہے جو بیمار کرے گا اِک روز

احمد امتیاز

بتا وہم و گماں ہونے سے پہلے
کہاں تھے ہم یہاں ہونے سے پہلے

نہ جانے کیسا منظر تھا خلاء کا
زمین و آسماں ہونے سے پہلے

نہیں تھی آشنا خونِ بشر سے
زمیں آباد یاں ہونے سے پہلے

مقدر کیمیاء ہونا کہاں تھا
محبت داستاں ہونے سے پہلے

کہاں گردانتے تھے فاصلوں کو
دِلوں کے درمیاں ہونے سے پہلے

وہ سادہ لوح کتنا بے ضرر تھا
ہمارا رازداں ہونے سے پہلے

ملے ہو کس لیے اب خاک ہو کر
کہاں تھے رائیگاں ہونے سے پہلے

تو کیا کوئی حویلی تھی ہماری
کرائے کا مکاں ہونے سے پہلے

ہماری شہر میں اوقات کیا تھی
اِک اُس کے مہرباں ہونے سے پہلے

دِلوں میں زخم کیسے تھے کہ ہم بھی
ہوئے بوڑھے جواں ہونے سے پہلے

اُجالے کی بشارت دے گئے ہیں
ستارے بے نشاں ہونے سے پہلے

ooo

مرے جسم و جاں میں بسی ہوئی تھی جو بے بسی مجھے کھا گئی
جو خدا نے کی تھی عطا مجھے وہی زندگی مجھے کھا گئی

جو میں خامشی سے گزارتا تو کسی سے ہوتا گلہ بھی کیا
سرِ کوئے عمر قدم قدم کی نواگری مجھے کھا گئی

نہ علَم تھا ہاتھ میں فتح کا نہ شکست خوردہ بدن مرا
میں کسی شمار میں کیوں نہیں یہی بے کلی مجھے کھا گئی

ہوا حال دونوں کا ایک سا کوئی زخم اپنے نہ سی سکا
اُسے کم نگاہی نگل گئی تو سبک سری مجھے کھا گئی

کیا اپنے آپ کو رائیگاں کسی مہرباں کی سنی کہاں
مرا دُشمن اور نہیں کوئی مری خودسری مجھے کھا گئی

سبھی زخم تھے مرے لادوا مرے چارہ گر کا قصور کیا
جو اَزل سے میرے لہو میں تھی وہ شکستگی مجھے کھا گئی

رہا دِین کا نہ میں دہر کا وہ تھا نشہ شعر کے زہر کا
مرے ساتھ سانحہ یہ ہوا کہ سخن وری مجھے کھا گئی

مرے ساتھ تھا تو قدم قدم کسی پل جدا نہ ہوئے تھے ہم
مجھے پھر بھی کیوں یہ ملال ہے کہ تری کمی مجھے کھا گئی

اگر امتیاز حسب نسب مہ و مہر ہوتے تو دیکھتا
میں کسی قبیلۂ شب سے تھا جو یہ روشنی مجھے کھا گئی

احمد خیال

میں وحشت و جنوں میں تماشا نہیں بنا
صحرا مرے وجود کا حصہ نہیں بنا

اس بار کُوزہ گر کی توجہ تھی اور سمت
ذرّہ ہماری خاک سے کیا کیا نہیں بنا

سوئی ہوئی اَنا مرے آڑے رہی سدا
کوشش کے باوجود بھی کاسہ نہیں بنا

یہ بھی تری شکست نہیں ہے تو اور کیا
جیسا تو چاہتا تھا میں ویسا نہیں بنا

ورنہ ہم ایسے لوگ کہاں ٹھہرتے یہاں
ہم سے فلک کی سمت کا زِینہ نہیں بنا

جتنے کمال رنگ تھے سارے لیے گئے
پھر بھی ترے جمال کا نقشہ نہیں بنا

رُک سا گیا ہے وقت سے پہلے ہی میرا چاک
مجھ کو یہ لگ رہا ہے میں پورا نہیں بنا

ooo

سیر کرنی ہے بہت دیر مجھے پانی کی
کبھی مٹی سے اگر بات بنے پانی کی

رنگ لہروں سے گلے ملتے نظر آتے ہیں
بات ہوتی ہے عجب شام ڈھلے پانی کی

جسم کے ساتھ دل و جان بھی شاداب کروں
کاش مِل جائے مجھے جھیل ہرے پانی کی

یہ ہے کُہسار پہ بیٹھے ہوئے درویش کا فیض
بہتی رہتی ہے ندی نور بھرے پانی کی

آنکھ بھر آتی ہے، سینے سے دُھواں اُٹھتا ہے
جب محرم میں کوئی بات کرے پانی کی

لعنتیں بھیجتا رہتا ہے ستم گاروں پر
گر کوئی دھیان سے آواز سنے پانی کی

ooo

دشت میں چلتے ہوئے آب نہیں دیکھتا میں
خواب اچھے ہیں مگر خواب نہیں دیکھتا میں

ایک وحشت میں لپکتا ہوں فلک کی جانب
چودھویں رات کا مہتاب نہیں دیکھتا میں

سچ کی خاطر مجھے نقصان کی پرواہ نہیں
بات کہنی ہو تو احباب نہیں دیکھتا میں

عشق دیوانگی ہے، عقل سے آگے کی عطا
سو کبھی عشق میں آداب نہیں دیکھتا میں

جس سمے میرے مقابل ہوں مرے یار سبھی
اس سمے ہار کے اسباب نہیں دیکھتا میں

مجھے مہتاب تہ آب بلاتا ہے خیال
چاندنی رات میں تالاب نہیں دیکھتا میں

احمد سلیم رفی

جسم جب جل چکا تو جلنے لگا
ایسا صدمہ کہ دِل بہلنے لگا

لوگ سمجھے کہ مر گیا ہوں میں
جونہی میں خاک داں بدلنے لگا

جس کا لہجہ سنوارا تھا میں نے
میرے بارے میں زہر اُگلنے لگا

دیکھ دُنیا! خدا کی طاقت دیکھ
میں ترے ہاتھ سے نکلنے لگا

جیسے پتھر کو موت آ رہی ہو
اُس کو چُھو کر میں یوں پگھلنے لگا

دِل ہتھیلی پہ رکھ دِیا ہم نے
اور ہتھیلی پہ دِل مچلنے لگا

ooo

تجھ سے بیزار ہو رہا ہوں میں
یعنی بیمار ہو رہا ہوں میں

مجھ میں رستہ تلاشنے والے
تجھ میں دیوار ہو رہا ہوں میں

قبلہ اُس نے بدل لیا اپنا
اور گنہگار ہو رہا ہوں میں

چاروں سمتیں پکارتی ہیں مجھے
اور تیار ہو رہا ہوں میں

اب ترا ہجر میرے بس کا نہیں
دست بردار ہو رہا ہوں میں

ooo

(نذرِ عرفان صدیقی)

دِیا ہے زخم تو اب اس کا اندمال بھی کر
تو کیسا شعبدہ گر ہے کوئی کمال بھی کر

رہائی بھی مجھے عزت سے احترام سے دے
مری فضا مری آوارگی بحال بھی کر

اب آ گئے ہیں تری دسترس میں برق و بار
مرے حریف! مرا ظرف پائمال بھی کر

دُعا بھی دے مجھے عزت کی موت مرنے کی
مری پگھلتی ہوئی عمر کا خیال بھی کر

یونہی نہیں تجھے وحشت کے گُر سکھاؤں گا
مجھے بنا مرے صحرا کی دیکھ بھال بھی کر

دِکھا دیا ہے نیا چاند اور نیا سورج
تو اس جزیرے پہ ترسیلِ ماہ و سال بھی کر

بس اِتنا کر کہ ذرا بات آگے چلتی رہے
میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کوئی سوال بھی کر

احمد شہباز خاورؔ

سیلِ سفّاک اس کی راہ میں ہے
جو جزیرہ مری نگاہ میں ہے

اِک زمانہ جسے جھکا نہ سکا
سرنگوں دِل کی بارگاہ میں ہے

ہم جسے سطحِ آب پر چاہیں
وہ گُہر تو کہیں اتھاہ میں ہے

مجھ کو جائے امان ہے ہر جا
لفظ جب تک مری پناہ میں ہے

اس سے ناخوش ہیں پر خوشی اپنی
اس کی قربت میں اس کی چاہ میں ہے

آب و آتش ہیں اور یکجا ہیں
جانے کیا بھید اس نباہ میں ہے

مجھ سے دُشمن بھی کر نہیں سکتا
جتنی نفرت مری سپاہ میں ہے

میرا سب کچھ جلا نہ دے خاورؔ
یہ شرر سا جو سردِ آہ میں ہے

OOO

میرے غم کا اسے ملال نہ تھا
واقفِ حال حسبِ حال نہ تھا

جس محبت کو رو رہے ہو وہ کل
کس زمانے میں پائمال نہ تھا

تجھ سے کچھ اِس طرح تھے وابستہ
واسطہ خود سے بھی بحال نہ تھا

پاک جذبوں کا نیک سوچوں کا
تھا مگر اس قدر بھی ''کال'' نہ تھا

زخمِ ہجراں سے یاریاں تھیں بہت
اور کوئی فکرِ اندمال نہ تھا

میں کہ سورج تھا اور مرا ڈھلنا
یہ کوئی آخری زوال نہ تھا

عام لوگوں میں خاص تھا خاورؔ
خاص لوگوں میں باکمال نہ تھا

OOO

اختر رضا سلیمی

دیکھو! یہ دیکھنا بھی کہیں رائگاں نہ ہو
جس پر نظر ہے مرتکز اُس کا نشاں نہ ہو

ممکن ہے ایک روز ملیں اس طرح بھی ہم
دیوار کوئی وصل کی بھی درمیاں نہ ہو

شاید بدل لیا ہے بہاروں نے پیرہن
جس کو خزاں سمجھ رہے ہیں وہ خزاں نہ ہو

ممکن ہے ایک وہم ہو بود و نبود بھی
ممکن ہے سب فریب ہو کچھ بھی یہاں نہ ہو

ایسا نہ ہو وہاں سے مری واپسی تلک
اس گردِ ماہ و سال کا نام و نشاں نہ ہو

اخترؔ غزل میں کتنی سہولت سے ڈھل گیا
وہ دُکھ جو گفتگو میں کسی سے بیاں نہ ہو

ooo

جی میں ہے اس جہاں کو دوبارہ بنائیے
جیسا یہ بن نہیں سکا ، ویسا بنائیے

اس بار کوئی نقش نہ رکھیے نگاہ میں
اس بار کوئی اور ہی نقشہ بنائیے

اب خواب پر اُٹھائیے بنیادِ دو جہاں
جو بن چکا کچھ اس کے علاوہ بنائیے

اس تشنگی کو ڈھالیے قطرے میں اور پھر
قطرے کو جھیل ، جھیل کو دریا بنائیے

لایا ہوں آپ کی لیے چاندی کی بالیاں
کانوں میں ان کو ڈال کے سونا بنائیے

اسلوبِ میر و مرزا قیامت سہی مگر
رہنا ہے گر غزل میں تو لہجہ بنائیے

گھر سے کوئی نکلنے کو تیار ہی نہیں
اب کس کے واسطے کوئی رستہ بنائیے

اخترؔ اب اس میسّر و موجود سے الگ
رہنے کو کوئی دوسری دُنیا بنائیے

ooo

دِل و نگاہ پہ طاری رہے فسوں اُس کا
تمہارا ہو کے بھی ممکن ہے میں رہوں اُس کا

زمیں کی خاک تو کب کی اُڑا چکے ہیں ہم
ہماری زد میں ہے اب چرخِ نیلگوں اُس کا

تجھے خبر نہیں اِس بات کی ابھی شاید
کہ تیرا ہو تو گیا ہوں مگر میں ہوں اُس کا

اب اس سے قطعِ تعلق میں بہتری ہے مری
میں اپنا رہ نہیں سکتا اگر رہوں اُس کا

دلِ تباہ کی دھڑکن بتا رہی ہے رضاؔ
یہیں کہیں پہ ہے وہ شہرِ پُرسکوں اُس کا

اِرشاد جالندھری

قربتوں میں رہ کے اُس کا قرب اگر حاصل نہ ہو ... اس سے بہتر تو یہی ہے آرزوئے دِل نہ ہو
اے مرے پروردگار اب یہ دُعا تو کر قبول ... ہمسفر ہو وہ مرا اور کوئی بھی منزل نہ ہو
دیوتا ہے وہ تو مانے یا نہ مانے کیا گلہ! ... تُو پجاری ہے تو اپنے فرض سے غافل نہ ہو
کرب کا احساس بھرا اشعار میں بے شک، مگر ... وہ غزل بھی کیا ہے جس میں رنگِ خونِ دِل نہ ہو
لٹ گیا ہے کارواں جو عین منزل کے قریب ... سوچ، اس سازش میں میرِ کارواں شامل نہ ہو
تو بھی میرے ساتھ ہو جب جستجو کے ہجر میں ... ہر بھنور کو رشک آئے اور کہیں ساحل نہ ہو

آج تک اِرشاؔد جو پائی نہیں دادِ وفا
یہ بھی ممکن ہے ترا ایثار اس قابل نہ ہو

ooo

چلو مانا مکیں اکثر مکاں اپنے بدلتے ہیں ... مگر جو دِل میں بس جائیں وہ کب دِل سے نکلتے ہیں
بہت مُدّت ہوئی اُن سے نہیں ہے رابطہ، لیکن ... میں اُن کا نام لوں سہواً تو پھر بھی لوگ جلتے ہیں
ہیں جذبے پھول سے نازک اِرادے اس قدر پختہ ... وہاں ثابت قدم ہوں میں جہاں پتھر پگھلتے ہیں
بڑھیں تھیں تلخیاں جن میں انھی منحوس لمحوں پر ... اگر پچھتا رہے ہیں ہم تو وہ بھی ہاتھ ملتے ہیں
مسافر سر پھرے ہیں کس قدر چاہت کی منزل کے ... جہاں ہو ہر قدم ٹھوکر انھی راہوں پہ چلتے ہیں
سلگنا ، پھر تڑپنا ، ٹوٹنا ، جلنا ، بکھر جانا ... تمھیں پانے کی خاطر ہم کئی سانچوں میں ڈھلتے ہیں

یہ ہے اِرشاؔد خوش فہمی سنبھل جائیں گے ہم ، لیکن
نظر اُن پر پڑے جن کی بھلا وہ کب سنبھلتے ہیں

ooo

اشرف سہیل

میں کچھ دِن اور جینا چاہتا ہوں
وہ ترتیب و قرینہ چاہتا ہوں
مرے سینے میں جتنے زخم بھی ہیں
انھیں پھولوں سے سینا چاہتا ہوں
کہ محتاجی ہے رِشتوں کا تقدس
میں ساتھ ان سب کے جینا چاہتا ہوں
اُبھرتی ڈوبتی موجوں سے کہہ دو
میں دریا ہوں سفینہ چاہتا ہوں
میرے اجداد کی تہذیب یہ ہے
میں پتھر میں نگینہ چاہتا ہوں
نہ چکنا چور ہو جو ٹوٹنے سے
اِک ایسا آبگینہ چاہتا ہوں
مرا ہر اِک گنہ وہ بخش دے جب
بس اِک ایسا مہینہ چاہتا ہوں

ooo

دیکھو نہ کرو پیار میں بیوپار کی باتیں
پازیب کی، گھنگھرو کی نہ جھنکار کی باتیں
ہم سے جو ملو تم تو مقدس ہمیں جانو
ہم ہی سے تو قائم ہیں گل وخار کی باتیں
دُنیا میں رہو اور کرو بات یہاں کی
کیوں کرتے ہو تم ہم سے اُفق پیار کی باتیں
پھولوں کے تبسّم کو اُڑاؤ نہ ہنسی میں
دیکھو نا کرو ہم سے یوں بے کار کی باتیں
اُونچا نہ اُڑو اِتنا کہ پر کاٹ دیئے جائیں
بازو پہ بھروسہ ہے یہ بے کار کی باتیں

ooo

اشرف یوسفی

ایک ستارہ شب بھر جاگا
ہجر کا مارا شب بھر جاگا
رات تری خوشبو کیا آئی
کمرہ سارا شب بھر جاگا
چاند نے جھک کر بات کہی کچھ
اور نظارہ شب بھر جاگا
موج نے اپنی کروٹ بدلی
اور کنارہ شب بھر جاگا
راکھ ہوا دِل راکھ کے اندر
ایک شرارہ شب بھر جاگا
اُس نے آدھا خواب دِکھایا
اور میں سارا شب بھر جاگا
ایک کنارہ شب بھر سویا
ایک کنارہ شب بھر جاگا
ریزہ ریزہ دِن بھر بکھرا
پارہ پارہ شب بھر جاگا
میں نے آنکھ کی جھیل میں اشرفؔ
چاند اُتارا ، شب بھر جاگا

ooo

بُجھ گیا کارواں چراغوں کا
دُور تک ہے دھواں چراغوں کا
کچھ نہ تھا جُز غبارِ شامِ الم
مجھ کو گزرا گماں چراغوں کا
کس طرح آندھیوں سے ٹکرائے
کچھ تو ڈھونڈو نشاں چراغوں کا
تم گئے اور بُجھ گئے دِل بھی
کیا کریں رفتگاں! چراغوں کا
دیکھنا تھا جمالِ رنگِ سحر
دیکھتے ہیں دھواں چراغوں کا
صبح تک کون سرخرو ہو گا
رات ہے اِمتحاں چراغوں کا
لَو کی رفتار کیسے ناپو گے
یہ مکاں ، لامکاں چراغوں کا
ایک میں تھا یا میری تنہائی
لوگ سمجھے جہاں چراغوں کا
چشمِ سیّارگاں نے دیکھا کیا
جو ہے انجام یاں چراغوں کا
دیکھ چپ چاپ ، ہاؤ ہو کیسی
دِل تو ہے آستاں چراغوں کا
دیکھ منظر ہے اور ہی اشرفؔ
دُھند کے درمیاں چراغوں کا

اصغرعلی بلوچ

آئنوں کے نگر میں رہتا ہوں
پتھروں کی نظر میں رہتا ہوں
کوئی آتا ہے اور نہ جاتا ہے
ایسے ویران گھر میں رہتا ہوں
ٹوٹ جاؤں تو جُڑ نہیں پاتا
کوچۂ بے ہنر میں رہتا ہوں
جانتا ہے نہ مانتا ہے کوئی
حلقۂ بے اثر میں رہتا ہوں
شہر یاروں سے منصفی چاہوں
شہر بے داد گر میں رہتا ہوں
حادثے روز پیش آتے ہیں
روز تازہ خبر میں رہتا ہوں
اُس کی سوچوں میں غرق ہوں اصغؔر
دائروں میں ، بھنور میں رہتا ہوں

ooo

تو جہاں ہے وہیں نہیں موجود
اس کے معنی کہیں نہیں موجود
بے ستوں ایک شامیانہ ہے
آسماں پر زمیں نہیں موجود
کون مہمان بن کے آئے وہاں
جس مکاں کا مکیں نہیں موجود
دشتِ دُنیا میں کوئی کیا بھٹکے
کوئی تجھ سا حسیں نہیں موجود
ہر جبیں کو ہے خواہشِ سجدہ
اور سنگِ جبیں نہیں موجود
داستانیں رقم ہیں چہروں پر
کوئی قاری ذہیں نہیں موجود
کوئی صورت گری نہیں اصغؔر
جب سے شکلِ متیں نہیں موجود

ooo

اِفتخار شفیع

جدید ہوتے ہوئے کہنہ سال آدمی ہوں   میں آپ اپنے لیے اِک سوال آدمی ہوں
مجھی سے روشنی پاتے ہیں اختر و مہ تاب   شبِ سیاہ میں سورج مثال آدمی ہوں
مری تلاش میں پھرتی ہے ریگِ صحرا بھی   میں اپنے دشت میں ہوں اور غزال آدمی ہوں
بہت سنبھال کے رکھو مجھے کہ میں صاحب!   عروجِ دَور میں محوِ زوال آدمی ہوں
مجھے بھی نخلِ تمنا کی رہگزار میں دیکھ   میں برف زار میں پتّوں پہ شال آدمی ہوں
مجھے پکار کے دیکھو انھی اندھیروں میں
میں اپنے عہد کا روشن خیال آدمی ہوں

OOO

سب طرح کے حالات کو اِمکان میں رکھا   ہر لمحہ اسے سوچ میں وجدان میں رکھا
ہجرت کی گھڑی ہم نے ترے خط کے علاوہ   بوسیدہ کتابوں کو بھی سامان میں رکھا
اِک عمر گزاری نئے آہنگ سے لیکن   اجداد کی اقدار کو بھی دھیان میں رکھا
مجھ کو مری قامت کے مطابق بھی جگہ دی   یہ پھول اُٹھا کر کبھی گلدان میں رکھا؟
اِک روز ، سیہ رات ہتھیلی پہ سجا کر   صحرا نے قدم خطّۂ گنجان میں رکھا
ہونٹوں کو سدا رکھا تبسّم سے عبارت
اِک زہر بجھا تیر بھی مسکان میں رکھا

OOO

افضل حمید

اشکِ ملالِ چشم چھپایا نہیں گیا
پتھر جو ضبط کا تھا اُٹھایا نہیں گیا
کچھ لوگ ایسے لوگ تھے جو یاد رہ گئے
اِک عمر جن کو دِل سے بھلایا نہیں گیا
چاہا ، مگر جو مُدعا تھا کہہ نہیں سکے
لیکن جو راز تھا وہ چھپایا نہیں گیا
اِک بار جھک گیا جو اَدب سے ترے حضور
پھر اُس سے بار سر کا اُٹھایا نہیں گیا
اُس نخل کا ثمر ہے بلا کا جلا ہوا
یعنی وہ نخل لُو سے بچایا نہیں گیا
اُس نے بھی ہجر بیتی سنائی نہیں مجھے
مجھ سے بھی دِل کا زخم دِکھایا نہیں گیا
افضلؔ حمید ہی نہیں مجبور تھا اُدھر
مجھ سے بھی اُس کا ساتھ نبھایا نہیں گیا

ooo

اگر غم کا سمندر جاگتا ہے
مرا بھی دیدۂ تر جاگتا ہے
کوئی دِل جو محبت سے بھرا ہو
خدا اُس دِل کے اندر جاگتا ہے
کسی کو تو ہے حاصل قرب تیرا
کسی کا تو مقدر جاگتا ہے
سبھی ہیں محوِ خوابِ بندگانہ
مگر اِک مجھ میں خودسر جاگتا ہے
میں تنہا کب ہوں بن میں ساتھ میرے
کئی دِن سے صنوبر جاگتا ہے
ہوئی جاتی ہے دستک دِل کے در پہ
کوئی سپنوں کے اندر جاگتا ہے
کسی کی سرخ آنکھیں کہہ رہی ہیں
کہ وہ مجھ سے بھی بہتر جاگتا ہے
وہ میرے دُکھ سے ہے آگاہ جب سے
وہ اُس دم سے برابر جاگتا ہے
نصیبہ وہ قلندر ہے کہ افضلؔ
میں سو جاؤں تو شب بھر جاگتا ہے

ooo

اقبال اختر

سوچ کا سائبان خالی ہے
تختِ وہم و گماں خالی ہے
کوئی آنکھوں میں اب نہیں رہتا
پانیوں کا مکان خالی ہے
تیر یادوں کے اب نہیں چلتے
کب سے دِل کی کمان خالی ہے
لفظ بھی اب مزہ نہیں دیتے
ذائقوں سے زباں خالی ہے
ذوقِ رُوحِ بلال سے ہے تہی
یوں اثر سے اذان خالی ہے
دُکھ تو یہ ہے کہ آدمیّت سے
آج سارا جہان خالی ہے
پھر یہ کیا بیچتے ہو تم اختؔر
جب وفا کی دُکان خالی ہے

OOO

بحرِ حق میں شناوری کی ہے
بات ہر دَور میں کھری کی ہے
میں نے چھینا ہے جن سے حق اپنا
اُن کی نظروں میں خودسری کی ہے
بے سبب دار تک نہیں پہنچا
میرے محسن نے مخبری کی ہے
سر جلائے ہیں مشعلوں کی طرح
یوں بھی لوگوں کی رہبری کی ہے
لفظ جب کھو چکے تھے معنی کو
ایسی رُت میں سخنوری کی ہے
نہ ہی کشکول نے صدا کوئی
ہم نے یوں بھی گداگری کی ہے
کون آئے گا دار پر ملنے
کس نے اختؔر کی ہمسری کی ہے

OOO

آگہی کو جنوں میں ڈھالا ہے
ہم نے دامن میں سانپ پالا ہے
ہم کو ہر دور نے گراں سمجھا
ہم نے ہر دور کو سنبھالا ہے

ہم نے نفرت کے کاٹ کر پتھر　　پیار کا راستہ نکالا ہے
وہ اُجالوں کی قدر کیا جانیں　　جن کو تاریکیوں نے پالا ہے

پہنے پھرتا ہوں شوق سے اخترؔ
زندگی حسرتوں کی مالا ہے

○○○

تیرا میرا جو میل ہے پیارے　　آگ پانی کا کھیل ہے پیارے
کون جانے کہاں اُتر جائے　　زندگی ایک ریل ہے پیارے
بزمِ احباب ہے کہ مقتل ہے　　اپنا گھر ہے کہ جیل ہے پیارے
شیش محلوں کے سب چراغوں میں　　خونِ مفلس کا تیل ہے پیارے
موڑ لیتی ہے جس طرف چاہے　　مصلحت اِک نکیل ہے پیارے

دولتِ دِل میں کیا کمی اخترؔ
درد کی ریل پیل ہے پیارے

○○○

سارا دربار منتظر ہے مرا　　تختۂ دار منتظر ہے مرا
کتنا مقبول ہوں گلستاں میں　　ہر گُل و خار منتظر ہے مرا
ایک سایہ سا کتنی دیر ہوئی　　پسِ دیوار منتظر ہے مرا
مری دلچسپیاں خلاء سے ہیں　　اور گھر بار منتظر ہے مرا

خون دینا ہے پھر مجھے اخترؔ
ایک نادار منتظر ہے مرا

○○○

امجد شیخ

ہجر راتوں کے زمانے آئے اب مرے ہوش ٹھکانے آئے
لبِ دریا یہ کھڑا سوچتا ہوں کاش تو پیاس بجھانے آئے
پہلے خواہش سی بدن میں جاگے پھر تری یاد ستانے آئے
لوگ کہتے ہیں یہ امجدؔ تم کو
رِشتے ناتے نہ نبھانے آئے

ooo

دِل لگانا نہ دِل لگی کرنا تم زمانے کی پیروی کرنا
درد پھر ہجرتیں نہیں کرتا دیکھنا تم نہ عاشقی کرنا
لفظ سارے مری اَساس بنے یوں رہا اپنا شاعری کرنا
پستیاں پھر مجھے بلاتی ہیں اے خدا میری رہبری کرنا
تتلیاں تو تجھے بلائیں گی
اُن سے امجدؔ نہ دوستی کرنا

ooo

انیل چوہان

گھر کے جھگڑے جب زباں ہو کر گئے بازار تک
آ گئے پھر ہاتھ لوگوں کے ، مری دستار تک

بے خبر کب تک رہو گے نیند کے ماتو اُٹھو
دُشمن آ پہنچا تمہارے شہر کی دیوار تک

آیا ہوں اپنے بدن پر دھوپ کو اوڑھے ہوئے
بانجھ صحرا میں نہیں تھی ، شاخِ سایہ دار تک

ساعتوں کے سیل میں اس درجہ تیزی آ گئی
ہو گئے غرقاب یادوں کے جواں چھتنار تک

ڈوبنے والے سے ساحل کے مکیں تھے بے خبر
اُس کی چیخوں نے ہلا ڈالے مگر کہسار تک

خسروِ خورشید آیا پالکی میں نُور کی
رات کی تھی حکمرانی صبح کی یلغار تک

صرف سچے راستوں پر پاؤں اُٹھنے چاہئیں
فاصلہ ہی دوستو کتنا ہے گھر سے دار تک

ہو گئے محدود سارے وَلولے اپنے انیلؔ
پاؤں کو ڈستی ہوئی زنجیر کی جھنکار تک

OOO

جسے دیکھا نہیں اس خواب کی تعبیر کرتے ہیں
رسیلے لب پہ اپنی تشنگی تحریر کرتے ہیں

نظر سے لمس تک کیا کیا ہوئے ہیں تجربے ہم کو
چلو اس لمحۂ بے نام کی تشہیر کرتے ہیں

خیالِ یار نے آنا ہے دِل پر دستکیں دینے
چراغِ جاں جلا کر رات کو تنویر کرتے ہیں

کہیں عمرِ رواں مُرجھا نہ دے حسنِ گلاب اُس کا
تو سَرپٹ بھاگتے لمحوں کو ہم زنجیر کرتے ہیں

حقیقت میں کوئی شہرِ محبت ہو نہیں سکتا
انیلؔ اُس کو تصور ہی میں ہم تعمیر کرتے ہیں

OOO

بیدل حیدری

کیا جلاؤ گے تم سخن کے دِیے — تم نے آنسو پیئے نہ شعلے پیئے
یہ بڑا پن نہیں زمیں کا تو پھر — یہ فلک سرنگوں ہے کس کے لیے
اُس نے راہِ وفا دِکھائی مجھے — اور پھر ہاتھ پاؤں باندھ دِیے
آدمی چاہتا ہے زندہ رہوں — موت کو ضد کہ آدمی نہ جیئے
دِل ، پسِ مرگ جگمگاتا ہے — رکھ گیا کون یہ کفن میں دِیے
سوچتا ہوں لباس سلوا کر — میرے اندر کے چاک کون سیئے

شاعری ہو کہ عشق ہو بیدؔل
مَیں نے سب کام تن دہی سے کیے

OOO

مَیں جو تھک کر بیٹھا تھا — میرا بوجھ زیادہ تھا
کل میں کہاں سے گزرا تھا — رستہ پاؤں پکڑتا تھا
رونے پر پابندی تھی — میں مجبوراً ہنستا تھا
یہ جو ہم میں دُوری تھی — بیچ میں دریا پڑتا تھا
کیا کہتا بھونچال مجھے — میرا گھر لکڑی کا تھا

بیدؔل کیا بتلاؤں اب
ذہن میں اِک منصوبہ تھا

OOO

کوئی جادو جگانا چاہیے تھا — ہمیں کچھ کر دِکھانا چاہیے تھا
سحر تھی نوکرانی تو نہیں تھی — ہمیں خود جاگ جانا چاہیے تھا

شبِ غم کو کہیں جانے سے پہلے ہمارے پاس آنا چاہیے تھا
اُسے بھی سر پھروں کی جستجو تھی ہمیں بھی آستانہ چاہیے تھا
مری لغزش فقط لغزش نہیں تھی سنبھلنے کو زمانہ چاہیے تھا
محبت ہم سے محنت چاہتی تھی سو ہم کو محنتانہ چاہیے تھا
ہم اُس سے لاتعلق ہیں تو اب تعلق ٹوٹ جانا چاہیے تھا
وہ قابض تھا اگر جبراً دِلوں پر تو پھر قبضہ چھڑانا چاہیے تھا
کوئی آتا نہیں کیوں یاد بیدلؔ
کوئی تو یاد آنا چاہیے تھا

○○○

آنکھ کی نہر اور ہے ،نہر فرات اور ہے جب کہ سفر کی پیاس میں، بچوں کا ساتھ اور ہے
کیسے سناؤں چارہ گر! ، ایک بہت بُری خبر یہ کہ ترا مریضِ غم ، رات کی رات اور ہے
یہ جو گِلے کی بات تھی ، اور کسی کی بات تھی آپ تو میرے دوست ہیں، آپ کی بات اور ہے
کتنی عجیب بات ہے، ہاتھ بھی ہیں بٹے ہوئے لینے کا ہاتھ اور ہے ، دینے کا ہاتھ اور ہے
بیدلؔ راز چھوڑ دے، تلخ نوائی چھوڑ دے
کلمۂ خیر اور ہے ، رنج کی بات اور ہے

○○○

پارس کاسگنجوی

جب کوئی منزل تمہیں ہے روز وشب چلتے رہو ہے تمھیں چلنا اکیلے بے سبب چلتے رہو
رُک گئے کیوں ہمسفر یاد آ گیا شاید تمھیں وہ کہانی بھول جاؤ اور اب چلتے رہو
کیا سنو گے؟ کیا کہو گے؟ فائدہ کیا پاؤ گے؟ کان کر لو بند سی لو اپنے لب چلتے رہو
تم ہی بھولے تھے لگا بیٹھے جو دُنیا سے اُمید ساتھ دُنیا نے دیا ہے کس کا کب چلتے رہو
پست ہمت ہو گئی دستِ دُعا بھی جھک گیا
کس سے لو گے؟ کیا ملے گا؟ بےطلب چلتے رہو

ooo

بے حسی ایسا دِل کو مار گئی ''فکرِ دامانِ تار تار گئی''
نام گونجا خلاؤں میں رَب کا یہ کہاں تک مری پکار گئی
جا کے ٹکرائی اور پلٹ آئی چیخ جو سوئے کوہسار گئی
ہر پلک میں پرو دِیئے موتی کیا حسیں رات گہربار گئی
اس سلیقے سے کی بسر شبِ غم آرزوئے وصالِ یار گئی
جل گئے گل کھلا نہ غنچۂ دِل صحنِ گلشن سے یوں بہار گئی
پوچھتے ہیں وہ ''کون ہے پارس؟''
سادگی اُن کی ہم کو مار گئی

ooo

پرویز ساحر

حُسن اِک رَمزِ جاوِدانہ ہے
عشق اِک جذبِ والہانہ ہے

حُسن ہے ایک نغمۂ بے ساز
عشق احساسِ بے خودانہ ہے

حُسن اِک لوحِ پیکرِ سادہ
عشق اِک حرفِ محرمانہ ہے

حُسن ہے اِک حقیقتِ اَبدی
عشق اِک جادُوئی فسانہ ہے

حُسن آبِ حیات کا چشمہ
عشق اَسکندرِ زمانہ ہے

حُسن ہے ایک ظاہری دولت
عشق اِک باطنی خزانہ ہے

حُسن اِک شیوۂ خداوندی
عشق طورِ قلندرانہ ہے

حُسن اِک کائنات ہے ساؔحر
عشق حیرت کا کارخانہ ہے

OOO

جب بھی کوئی اُس پار بلاتا ہے مجھے
آواز کا چہرہ نظر آتا ہے مجھے

کیوں کر نہ مجھے ناز ہو اپنے دِل پر
عکسِ رُخِ دِل دار دِکھاتا ہے مجھے

کوئی تو ہے جو ، مار کے ہر شب مجھ کو
بستر سے سَرِ صبح اُٹھاتا ہے مجھے

جانے یہ مرا شوقِ جنوں ہے ، کیا ہے؟
پا بستہ ہی کھینچے لیے جاتا ہے مجھے

کہتے ہیں جسے اہلِ سخن ، خاموشی
بس ایک یہ طرزِ سخن آتا ہے مجھے

کیسے نہ بھلا شکر ادا اُس کا کروں
خود میرے ہی شر سے وہ بچاتا ہے مجھے

کس درجہ سخی ہے وہ مرا دُشمنِ جاں
اَمرت کی طرح زہر پلاتا ہے مجھے

کیا جانیے یہ کون ہے مجھ میں ساؔحر
ہر بار جو مجھ سے ہی لڑاتا ہے مجھے

OOO

تنویر شاہد محمد زئی

ٹوٹ گئے پلکوں کے ساحل، سانول موڑ مہار
مجھ مجبور سے جلدی آ مِل ، سانول موڑ مہار

صحراؤں میں کھل اُٹھے ہیں پھر چھالوں کے پھول
دُور ہوئی قدموں سے منزل، سانول موڑ مہار

گزری باتیں یاد کروں تو ملنا ہو ناممکن
ان باتوں سے اب کیا حاصل، سانول موڑ مہار

کب تک آخر تنہا بیٹھا کاگ سُنیہے بھیجوں
کب تک دُور رہے گی منزل، سانول موڑ مہار

کھیڑے بھیڑے آخر اپنی اَنت تلک آ پہنچے
لوٹ آنے میں اب کیا مشکل، سانول موڑ مہار

تپتے تھل نے اوڑھ لیا ہے ساون کا دوشالا
تُو یاد آیا ، چیخ اُٹھا دِل ، سانول موڑ مہار

روہی نے تنویرؔ دوبارہ آگ کے کنگن پہنے
اور اَٹا ہے دھول سے محمل ، سانول موڑ مہار

ooo

سینے میں دھڑک اُٹھّا دِل و جان سا چہرہ
سوچا ہوا لگتا ہے وہ انجان سا چہرہ

اِس دشت میں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو ہمہ وقت
سنسان سی آنکھیں مری ، ویران سا چہرہ

ناکردہ گناہوں کی معافی نہیں ہوتی
شانوں پہ لیے پھرتے ہیں تاوان سا چہرہ

کُھلتے ہوئے کچھ بندِقبا دیکھ رہا تھا
کس شوق سے اِک صاحبِ ایمان سا چہرہ

یہ بات الگ دیکھا ہے لاہور میں تجھ کو
روہی سی ہیں زُلفیں تری ، دامان سا چہرہ

ماضی کے طلسمات کے دَر وا نہیں ہوتے
کُھلتا نہیں صدیوں پہ وہ آسان سا چہرہ

ہوتی رہے ہر رات لب و رُخ کی تلاوت
ہاتھوں کی رحل میں رہے قرآن سا چہرہ

تنویرؔ دِکھاتا ہے شب و روز کرامت
اَشکوں کی ندی روک کے ڈھلوان سا چہرہ

ooo

جانِ عالم

ہر کوئی ہے جس طرح بندھا ہوا
میں نہیں جناب کا بندھا ہوا
صبح و شام ،رات دن یہ زندگی
سلسلہ ہے اک لگا بندھا ہوا
اک ہَوا میں ہیں سبھی یہاں وہاں
اک سماں ہے ہر جگہ بندھا ہوا
وہ ترا ہے یہ مرا ہے راستہ
جا نہیں ہے تُو مرا بندھا ہوا
آسماں ہی آسماں تھا ہر جگہ
میں کھلی زمیں پہ تھا بندھا ہوا
شکر ہے میں تیری یاد سے گیا
شکر ہے میں کھل گیا بندھا ہوا

ooo

دو چار قدم چپ کا سفر سات کریں ہم
لفظوں سے نکل کر بھی کوئی بات کریں ہم
وہ بھی تو کسی دن کوئی اعجاز دکھائے
اب اُس کے لئے کتنے کرشمات کریں ہم
دہلیزِ دلِ خستہ پہ آئی ہے اُداسی
آ رونقِ ہستی تجھے خیرات کریں ہم
اک روز تو ساتھ اپنے تری یاد نہ سوئے
اک روز اکیلے بھی بسر رات کریں ہم
اس واسطے چپ ہیں کہ سبھی بول رہے ہیں
بولے گا بھلا کون اگر بات کریں ہم

ooo

جلیل عالی

رات جو موجِ ہوا نے گُل سے دِل کی بات کہی
اِک اِک برگِ چمن نے کیسی کیسی بات کہی

آنکھیں رنگ برنگ سجے رستوں سرشار ہوئیں
دِل کی خلش نے منظر منظر ایک ہی بات کہی

ہر اظہار کی تہہ میں ایک ہی معنی پنہاں تھے
اپنی طرف سے سب نے اپنی اپنی بات کہی

آج بھی حرف و بیاں کے سب پیمانے حیراں ہیں
کیسے غزل نے دو سطروں میں پوری بات کہی

سیدھے سادھے سے لفظوں میں کہنا مشکل تھا
اسی لیے تو ایسی آڑی ترچھی بات کہی

تم کیوں اپنی مرضی کے مفہوم نکالو ہو
اِتنا ہی مطلب ہے ہمارا جتنی بات کہی

تم بھی تو مضمون تراشی میں مصروف رہے
تم نے بھی تو عالی کم کم اصلی بات کہی

جوادشیخ

غریبِ شہر کو بیدار کرنے والا تھا
میں تیرگی پہ یہی وار کرنے والا تھا
میں اپنی موت ، زیادہ حسین کرنے کو
مزید جرم سرِ دار کرنے والا تھا
رہِ نجات کی ایجاد سے بہت پہلے
میں طرزِ عام کا اِنکار کرنے والا تھا
خود اپنی فکر کی گہرائیوں میں گُم ہو کر
میں اپنی اصل کو بیدار کرنے والا تھا
جزا ، سزا سے مبرّا و ماورا ہو کر
میں ذہن و دِل کی حدیں پار کرنے والا تھا
اب اور ضبط کی طاقت نہ تھی مرے اندر
میں اپنے خواب کا پرچار کرنے والا تھا
اِس اِنتظار کا عادی تو مَیں نہ تھا جوّاد
مگر وہ کیا ہے کہ اِس بار کرنے والا تھا

ooo

مری سماعت کی تاب کو آزما رہا ہے
خموش رہ کر وہ شور مجھ میں مچا رہا ہے
خبرنہیں مَیں کہاں سے آیا، کہاں کھڑا ہوں
مگر کوئی ہے جو مجھ کو واپس بلا رہا ہے
غضب کی تاثیر جذبۂ عشقِ نو میں بھی ہے
پرانے زخموں کو اور گہرا بنا رہا ہے
یہ وقت خود ہم سے بڑھ کے ہے مہربان ہم پر
ہمیں مٹانے میں دیر کچھ تو لگا رہا ہے
سفر کے آخر میں اِک تھکاوٹ ہی ہاتھ آئی
مرا جنوں ہے کہ پھر بھی مجھ کو چلا رہا ہے
غمِ جہاں! تجھ سے اِس لیے بھی گریز پا ہوں
تری محبت میں ہر کوئی مبتلا رہا ہے
خیال کی حد کا بھی تعین تو کرنا ہو گا
وہاں اِجازت نہیں جہاں تک یہ جا رہا ہے
اِک آئینہ ہے جو میرا رختِ سفر ہے جوّاد
یہ آئینہ ہی جنوں کو رستہ دِکھا رہا ہے

ooo

حسن عباسی

ایک تجسّس کے اندھیاروں میں پھرتا ہوں
مشعل ہاتھ میں لے کر غاروں میں پھرتا ہوں
صدیوں پہلے کا اِک شہر آباد ہے مجھ میں
جس کی گلیوں اور بازاروں میں پھرتا ہوں
مجھ سے پوچھے کوئی رنگ اور مٹی کیا ہے
کیسے کیسے لالہ زاروں میں پھرتا ہوں
ایسے پھرتا ہوں اس جنگل کے پیڑوں میں
جیسے میں بچپن کے یاروں میں پھرتا ہوں
پھر بھی ان سے سیکھ نہیں پاتا ہوں کچھ بھی
سارا دِن میں دُنیاداروں میں پھرتا ہوں
میری آنکھیں ایسی غور سے دیکھتی ہے وہ
جیسے شب بھر بادہ خواروں میں پھرتا ہوں
جو خوابوں کے روگ لگا لیتے ہیں خود کو
اپنے جیسے اُن بیماروں میں پھرتا ہوں
جنگل میں جب جگنو ہاتھ نہیں آتے ہیں
جھیل کنارے چاند ستاروں میں پھرتا ہوں
اپنے نام کی لاج حسؔن رکھنی ہوتی ہے
پھول اُٹھا کر میں تلواروں میں پھرتا ہوں

ooo

ابر برسا ہے کہیں شام سے پہلے پہلے
ہو گئی شام حسیں شام سے پہلے پہلے
صبح وہ ہاتھ مرے ہاتھ میں کیا آیا تھا
گھوم لی ساری زمیں شام سے پہلے پہلے
دھول پڑنے لگی سورج پہ بیابانوں کی
آ گئے خاک نشیں شام سے پہلے پہلے
نیلے تالاب میں اب چاند نظر آتا ہے
اُس کو دیکھا تھا یہیں شام سے پہلے پہلے
دِیپ اور اَشک لیے لوگ اکٹھے تھے جہاں
آ گئے ہم بھی وہیں شام سے پہلے پہلے
دِن میں اچھا ہے کہ مئے خانے کا در بند رہے
بات بنتی ہی نہیں شام سے پہلے پہلے

ooo

یاد اذیت ناک بنا کر خواش ہوتا ہوں
جلتے دِیے کو ہاتھ لگا کر خوش ہوتا ہوں
یوں تو پھول بھی رکھے ہوتے ہیں کمرے میں
لیکن میں تلوار اُٹھا کر خوش ہوتا ہوں

اپنے پیار کا عادی کر لیتا ہوں جس کو — اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر خوش ہوتا ہوں
اُس کی بے بس آنکھیں جب بھی یاد آتی ہیں — میں چیزوں کو آگ لگا کر خوش ہوتا ہوں
اِک دُشمن نے ایسا جادُو کر رکھا ہے — میں پیاروں کو زہر پلا کر خوش ہوتا ہوں
وہ جو میرے سپنے دیکھنے لگ جاتی ہیں — اُن آنکھوں کی نیند اُڑا کر خوش ہوتا ہوں
جس کے دِل میں کوئی درد نہیں ہوتا ہے — اُس کے دِل میں درد جگا کر خوش ہوتا ہوں
خود کو زخمی کرتا ہوں تالاب کنارے — اور پانی میں خون مِلا کر خوش ہوتا ہوں
اُس کو ڈھونڈتا رہتا ہوں میں جنگل جنگل — مِل جائے تو خود کو چھپا کر خوش ہوتا ہوں

سپنے مرتے ہیں تو دفنانے سے پہلے
اُن کے سرہانے ساز بجا کر خوش ہوتا ہوں

ooo

مصروفیت میں تیری طرف دھیان کم نہیں — کم ہو تو جانتا ہوں کہ نقصان کم نہیں
چاہوں تو اُس محل سے اُٹھا لاؤں میں اُسے — دیواریں کم نہیں جہاں دربان کم نہیں
یہ میں جو پھرتا رہتا ہوں دُنیا میں بے خطر — کوئی نگاہ ہے جو نگہبان کم نہیں
ہجرت کی بات کرنے لگے ہیں تمام دوست — میں ایسے سانحے پہ پریشان کم نہیں
رہتا ہوں اُس کے ساتھ بھی اُس کے بغیر بھی — آباد کم نہیں ہوں میں ویران کم نہیں
پہلی نظر میں جس نے مجھے فتح کر لیا — میں اُس کو دیکھ دیکھ کے حیران کم نہیں

مجھ کو منافقوں کا پتہ چل گیا حسؔن
دُشمن کا میری ذات پہ احسان کم نہیں

ooo

حماد نیازی

مقامِ خاک پہ پہلے مجھے بٹھایا گیا
پھر ایک روز مجھے آسماں بلایا گیا

اسی جہان میں سارے جہان رکھے گئے
وہ اِک جہان جو اب تک نہیں دِکھایا گیا

شراب رکھی گئی ہونٹ کاٹ ڈالے گئے
پھر اس کے بعد مری پیاس کو بڑھایا گیا

عقیدتوں کو ہوس کا شکار بنتے ہوئے
یہاں رُلایا گیا اور بہت رُلایا گیا

تمہارے جسم کے اَندر کہیں سلگتا ہوں
میں اپنی آگ کے اندر نہیں جلایا گیا

ہوا میں شاخ بنائی گئی دُعاؤں کی
اور ایک آس پرندہ وہاں بٹھایا گیا

پھر اس کے بعد مری رُوح میں سکت نہ رہی
میں اعتبار کی سیڑھی سے جب گرایا گیا

OOO

قبلہ رُو ہو کے سر جھکانے لگا
آخری تیر میں چلانے لگا

جھیل میں دائرے اُبھرتے ہی
چاند کا جسم تھرتھرانے لگا

جانبِ دشت گامزن تھا میں
جب سمندر مجھے بلانے لگا

آخرِ شب کوئی صدا آئی
اور سب کچھ سمجھ میں آنے لگا

بس ابھی خاک سے بنایا تھا
اور ابھی خاک میں ملانے لگا

دیکھ دُنیا ہے میرے اندر بھی
ایک پتھر مجھے بتانے لگا

شام کے اوّلیں اِشارے پر
شبنمی خوں کوئی بہانے لگا

عجز کی شاہراہ پر چلتے
میں بلندی کی سمت جانے لگا

جذب کی آتشیں منڈیروں پر
آبِ حیرت کوئی گرانے لگا

آخرکار تھک گئیں آنکھیں
آخرکار میں ٹھکانے لگا

اُس کی تصویر سامنے رکھ کر
وہ میرے زائچے بنانے لگا

OOO

حیدر قریشی

کون دیکھے گا بھلا میرے خدا میرے بعد
رنگ لائے گی اگر میری دُعا میرے بعد

رُوبرو میرے بنا بیٹھا تھا پتھر کی طرح
کسی چشمے کی طرح پھُوٹ بہا میرے بعد

عشق کے قصّے سبھی مجھ پہ ہوئے آ کے تمام
کوئی مجنوں ، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد

اس میں مِل جائے گا جا کر مرے اَندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

جس نے دُشمن کو مرے قتل پہ اُکسایا ہے
لینا چاہے گا وہی خون بہا میرے بعد

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہو گا اَدا میرے بعد

روز طوفان اُٹھانے کی مشقت تھی اسے
دشت بے چارے کو آرام مِلا میرے بعد

میؔر و غالبؔ کی عطا اُن کی زمیں میں یہ غزل
حیدؔر اوروں پہ بھی ہو گی یہ عطا میرے بعد

خالد ملک ساحل

کچھ دل کا تعلق بھی نبھاؤ کہ چلا میں
کچھ ٹوٹ کے آوازہ لگاؤ کہ چلا میں

درپیش مسافت ہے کسی خواب نگر کی
اِک دِیپ مرے پاس جلاؤ کہ چلا میں

اِس شہر کے لوگوں پہ بھروسہ نہیں کرنا
گھر بار کو دروازہ لگاؤ کہ چلا میں

تا دل میں تمہارے بھی نہ احساسِ وفا ہو
جی بھر کے مجھے آج ستاؤ کہ چلا میں

بے کیف نگاہوں کا اثر ٹوٹ چلا ہے
چہرے پہ کوئی رنگ لگاؤ کہ چلا میں

اِس شہرِ مراسم میں تو سنگسار ہوا ہوں
پتھر ہی سر راہ سجاؤ کہ چلا میں

اِس تشنہ لبی کا مجھے اعزاز تو بخشو
اے بادہ کشو جام اُٹھاؤ کہ چلا میں

اس درجہ تغافل کی نہیں تاب جگر میں
تم اور بہانے نہ بناؤ کہ چلا میں

اک خواب ہے وہ خواب تو پورا کرو ساحلؔ
اک شعر مرا مجھ کو سناؤ کہ چلا میں

○○○

یہ دن، مہینے، سال بھی، مدت نہیں رہی
دِل جانتا ہے، پیار میں شدت نہیں رہی

خانہ بدوش آ گئے شہروں کے درمیاں
مجنوں کو بھی مکان سے وحشت نہیں رہی

خود کو اٹھا کے راہ میں رکھا ہے کھول کر
دیکھو تو میری زات میں غربت نہیں رہی

میں نے بڑے وقار سے دنیا کو تج دیا
کس نے کہا تھا عشق میں عزت نہیں رہی

اِک عالمِ خیال میں بسنے لگا ہوں میں
اس عالمِ وجود سے نسبت نہیں رہی

جی بھر کے اس جہان میں زندہ رہا ہوں میں
اب دل کو سرکشی کی بھی حسرت نہیں رہی

اس کنجِ بے نشان میں ساحلؔ، سکوں تو ہے
لیکن یہ مسئلہ ہے کہ شہرت نہیں رہی

○○○

اس کی طلب تھی زندگی، میں نے کہا جہان بھی   کس کو خبر تھی بے خبر مانگے گا آسمان بھی
ساری دعائیں بھول کر میں نے شکست مان لی   گھر تو بنا نہیں مگر، خالی نہ تھا مکان بھی
جل کر جو خاک ہو گئے، ان کو ہوا نہ لے اُڑے   میری ادا کی شان کا کچھ تو رہے نشان بھی
میں نے دُعائے خیر میں اس کو بھی ساتھ لے لیا   دیکھا تو اس کے ہاتھ میں، ترکش بھی تھا کمان بھی

خالد ملک جو آگ تھا، ساحل ہوا تو خاک ہے
شعر و سخن نے چھین لی اس کے بدن سے جان بھی

ooo

پہلے تو آب و تاب ستارے میں پھینک دی   پھر روشنی خیال کی زرّے میں پھینک دی
یہ کائنات، خالقِ واحد کا عشق ہے   کس نے سیاہی کفر کی نقشے میں پھینک دی
تُو وہ حسین شام ہے جس کے فریب میں   قدرت نے روشنی بھی اندھیرے میں پھینک دی
حیران ہوں میں آج بھی اپنے نصاب سے   کس نے کتاب عشق کی بستے میں پھینک دی
خواہش تو بے کنار تھی، لیکن مری حدود!   میں نے فقیری یار کے رستے میں پھینک دی
کیا بادِ بے حجابی چلی اب کے شہر میں   شوخی کھلے گلاب کی غنچے میں پھینک دی

پہلے انا کو ذات کا حصہ کیا ، مگر
پھر یہ چٹان توڑ کر سجدے میں پھینک دی

ooo

خاور جیلانی

اِس کا مطلب ہے وہ عشوہ گر نہیں پہنچا ابھی
کوئی بھی اوجِ ثریّا پر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے بغاوت ہو نہیں پائی فرو
طشت میں رکھا کسی کا سر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے دُعاؤں کی ضرورت ہے انھیں
دشت سے کوئی پلٹ کر گھر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے محبّانہ نہیں اُس کا چلن
جس کی دستک تک کسی کا در نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے ابھی حدِّ نظر موقوف ہے
کوئی بھی پیشِ نظر منظر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے بڑی اُونچی ہواؤں میں ہوں میں
ٹوٹ کر دھرتی پہ میرا پر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے بہادر ہی کہا جائے اُسے
جس کسی بزدل کے پیچھے ڈر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے جو رونا تھا اُسے میرے لیے
اُس کی آنکھوں میں وہ آبِ زر نہیں پہنچا ابھی

اِس کا مطلب ہے کہ خود کو معتمد سمجھوں ترا
جو اِدھر کوئی ترا مخبر نہیں پہنچا ابھی

ooo

ٹھہرا تھا میں حیرت سے گزرنے کے لیے ہی
منظر تھا مگر ٹوٹ بکھرنے کے لیے ہی

تصویر بنانے کا نہیں ہوں میں مصوّر
ہیں رنگ مرے رنگ نہ بھرنے کے لیے ہی

اُس جھیل پہ لائی ہے ہوس آبِ بقا کی
مخصوص ہے جو ڈوب کے مرنے کے لیے ہی

ہم لوگ تو وہ بخت کے مارے ہیں جنھوں نے
زِینہ بھی بنایا تو اُترنے کے لیے ہی

پھر یہ بھی تو سوچو کہ یہ دیوار کا رخنہ
ہے صرف سہولت سے گزرنے کے لیے ہی

کھل پائے مرے پنکھ تو اُس چرخ پہ جا کر
تھی جس کی ہَوا پنکھ کترنے کے لیے ہی

یہ صحن ہے ، آپس کی لڑائی کے لیے ہے
میدان ہے یہ مارنے مرنے کے لیے ہی

میں چاک پہ آیا ہوں ترے لمس کی خاطر
مٹی میں مِلا ہوں میں سنورنے کے لیے ہی

سپنوں میں کھلے پھول ، ہُوا کرتے ہیں شاید
تعبیر کے گلدان میں دھرنے کے لیے ہی

گو کسی اور فلک اور زمانے کا تھا
پھر بھی کردار وہ ہر ایک فسانے کا تھا

دشت یہ تھا ہی نہیں اور کسی کے دم کا
یہ خرابہ کہ ہمارے ہی بسانے کا تھا

ہائے وہ شہرِ محبت کہ ہوا ہے برباد
ہائے وہ نام کہ جو اُس میں کمانے کا تھا

مُدّتوں خود پہ لیے پھرتا رہا آبلہ پا
راستہ وہ جو کسی سمت نہ جانے کا تھا

کیا خبر تھی کہ صنم خانۂ دِل کا ہو گا
وہ پتہ جو کسی نایاب خزانے کا تھا

جانے کن خواب گھوں میں تھا ترا رُخِ روشن
مسئلہ ہاتھ کو جب ہاتھ سُجھانے کا تھا

یاد آیا ہے بہت آج وہی شخص کہ جو
ساتھ نبھنے کا تھا اور ساتھ نبھانے کا تھا

کیا زباں اور سبھی کے تھی دہن میں میری
کیا سبھی اور کا سر میرے اُٹھانے کا تھا

جانے اب اِس پہ بنی کیا ہے وگرنہ یہ دماغ
کوئی دِن گزرے نہیں ، اپنے ٹھکانے کا تھا

ooo

خود سے جو بے خبر رہا ہوں میں
خیر سے خوش بسر رہا ہوں مَیں

بھانپ لیتا ہوں ماجرا غم کا
موجۂ چشمِ تر رہا ہوں مَیں

پوچھیۓ اُس سے خال و خد میرے
جس کا حُسنِ نظر رہا ہوں مَیں

اپنا ہونے کی بات ہے یہ بھی
اُس کا ہو کر اگر رہا ہوں مَیں

فیصلہ ہو نہیں رہا مجھ سے
جی رہا ہوں کہ مر رہا ہوں مَیں

حادثے میں قیام کرتے ہوئے
سانحے سے گزر رہا ہوں مَیں

چُھو کر اِک ایک لاش مقتل کی
خود کو محسوس کر رہا ہوں مَیں

لفظ تریاق ہیں مرے لیکن
خودکلامی سے ڈر رہا ہوں مَیں

آپ تو مجھ سے آشنا ہوں گے
آپ کی رہ گزر رہا ہوں مَیں

ooo

خلیق الرحمٰن

تتلی کے پنکھ پھول میں سمٹی ہوئی تھی شام
وادی کے دشت و کوہ میں پھیلی ہوئی تھی شام

جنگل کی سبز گھاس پہ تھی دُھوپ کی شفق
نیلی فضا میں چار سو بکھری ہوئی تھی شام

کتنے طویل سائے تھے ٹھنڈی تھی کتنی دھوپ
پھولوں کے ساتھ بیل سے لپٹی ہوئی تھی شام

گھر کے قریب پہنچا تو مجھ سے لپٹ گئی
رَستے میں جیسے دیر سے بیٹھی ہوئی تھی شام

جھیلوں کے نیلے پانی میں تھی دھوپ کی شفق
پربت پہ آج اور بھی نکھری ہوئی تھی شام

سورج مکھی کے پھول پہ تھا عکس دھوپ کا
آئینہ رکھ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی شام

گولی چلی تو خوف سے اُڑتی چلی گئی
چڑیا کے ساتھ شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی شام

رخصت کے وقت باغ کا منظر عجیب تھا
آنسو تھے اُس کی آنکھ میں بھیگی ہوئی تھی شام

ooo

ٹھہرے ٹھہرے چلتے چلتے پانیوں میں کھو دیے
کیسے کیسے عکس ہم نے آئینوں میں کھو دیے

ایک دیوارِ اَنا تھی ٹوٹ نہ پائی کبھی
کتنے پیارے دوست ہم نے نفرتوں میں کھو دیے

رائیگانی کے علاوہ ہاتھ اپنے کیا لگا
جو اثاثے تھے وہ ہم نے ہجرتوں میں کھو دیے

رفتہ رفتہ شدتوں میں کچھ کمی آتی گئی
دِل کے گہرے درد ہم نے آنسوؤں میں کھو دیے

ہر مقامِ آخری پر اور ہی تعبیر تھی
وہ سنہرے خواب ہم راستوں میں کھو دیے

کتنے چہرے دیکھ کر پھر دیکھ نہ پائے کبھی
کیسے کیسے نقش ہم نے بارشوں میں کھو دِیے

خوبصورت وقت تھا جو لوٹ کر نہ آئے گا
وہ سنہرے دِن گزرتی ساعتوں میں کھو دِیے

ooo

خورشید ربانی

عکسِ گُل ہوں کہ نقشِ حیرت ہوں — آئینے! میں تری ضرورت ہوں
گونجتا ہوں دِلوں کے گنبد میں — ایک آوازۂ محبت ہوں
میں ہوں اِک پیکرِ خیال و خواب — اور کتنی بڑی حقیقت ہوں
داستاں ہوں گئے زمانوں کی — ایک بوسیدہ سی عمارت ہوں
گرچہ میں حرفِ خاک ہوں خورشیدؔ — پھر بھی زیبِ کتابِ فطرت ہوں

ooo

ملال حسرتِ ناکام کا دِیا ہی نہ ہو — یہ دردِ دِل بھی محبت کا سلسلہ ہی نہ ہو
ہمارے دِل میں اگر آئے تو چمک اُٹھے — وہ اِک خیال جسے کوئی سوچتا ہی نہ ہو
اُفق اُفق پہ جو روشن ہوئی لہو کی لکیر — وہ تیرا جرم نہ ہو میری بے گناہی نہ ہو
ہوئی ہے صبح چلو ہم بھی جا کے دیکھ آئیں — پسِ غبارِ شفق کوئی جل بجھا ہی نہ ہو
درِ خیال پہ دستک ہوئی تو سوچتا ہوں — دِلِ حزیں یہ کوئی موجۂ ہوا ہی نہ ہو
میں اس خیال سے خورشیدؔ لوٹ آیا ہوں — کوئی کہیں پہ میری راہ دیکھتا ہی نہ ہو

ooo

اُس کا بندِ قبا کُھلا ہوا تھا — یا کوئی عکس آئینہ ہوا تھا
بات کرنے کو لفظ تھے ہی نہیں — آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا تھا
کوئی آیا تھا میرے گھر میں اور — سارا آنگن کِھلا کِھلا ہوا تھا
کس کی خاطر اُجاڑ رستے پر — پھول لے کر شجر کھڑا ہوا تھا
مجھ کو ٹھوکر لگی تو یاد آیا — سنگ رستے میں کیوں پڑا ہوا تھا
چاندنی جھیل میں اُترتے دیکھ — پیڑ سکتے میں آ گیا ہوا تھا

پائمالی کو جستجو تھی مری
اس لیے خاک میں مِلا ہوا تھا

دانیال طریر

رنگ اور نور کی تمثیل سے ہو گا کہ نہیں
شب کا ماتم مری قندیل سے ہو گا کہ نہیں

اب نہ ہاتھی نظر آتے ہیں نہ ہاتھی والے
اب وہی کام ابابیل سے ہو گا کہ نہیں

آیتِ تیرہ شبی پڑھتے ہوئے عمر ہوئی
سامنا اب بھی عزازیل سے ہو گا کہ نہیں

اِک یہی سوچ مجھے نوچ رہی ہے کب سے
وہ جو ہونا ہے وہ تاویل سے ہو گا کہ نہیں

زرد مٹی میں اُترتی ہوئی اے قوسِ قزح!
خواب پیدا تری ترسیل سے ہو گا کہ نہیں

اوس کے پھول مہکتے ہیں تری آنکھوں میں
ان کا رِشتہ بھی کسی نیل سے ہو گا کہ نہیں

اے زمینوں میں اُتارے ہوئے لوگوں کی خدا!
کوئی زندہ تری تعمیل سے ہو گا کہ نہیں

جب سخن کرنے لگوں گا میں تجھے عصرِ رواں
اِستعارہ کوئی انجیل سے ہو گا کہ نہیں

OOO

گماں اندر گماں کی کیفیت ہے
زمیں پر آسماں کی کیفیت ہے

بدن پر برف کو محسوس کرنا
کوئی آبِ رواں کی کیفیت ہے

سرِ صحرا ، گلابی خواب جینا
کہاں ہوں اور کہاں کی کیفیت ہے

تری پوروں میں خوشبو موگرے کی
مگر رُخ پر خزاں کی کیفیت ہے

یہ کیسا تجربہ ہے سوچتا ہوں
مکاں میں لامکاں کی کیفیت ہے

کوئی آواز اُبھری ہے بدن میں
سکوتِ جاوداں کی کیفیت ہے

نہیں ہوں میں نہیں ہوں بولتا ہوں
نہیں میں یعنی ہاں کی کیفیت ہے

ترے لب جھیل پر اُبھرے ہوئے ہیں
عجب زخمِ نہاں کی کیفیت ہے

طریرؔ اِک بار جینا چاہتا ہوں
جو سب آئندگاں کی کیفیت ہے

ڈاکٹر آصف مغل

کون ہے میری طرح زندہ روایات کے ساتھ
لوگ چہرے بھی بدل لیتے ہیں حالات کے ساتھ
وہ مجھے چھوڑ گیا درد کی سوغات کے ساتھ
اب تو آنکھیں بھی چھلک جاتی ہیں ہر بات کے ساتھ
ابرِ باراں کی دُعا مانگنے والو رُکنا!
دیکھو طوفاں بھی چلے آتے ہیں برسات کے ساتھ
چلتا جاتا ہوں رہِ زیست کے ہنگاموں میں
جیسے مفلس کوئی بچہ کسی بارات کے ساتھ
تو نے اِک پل میں فراموش کیا ہے مجھ کو
اور مرے کتنے زمانے تھے تری ذات کے ساتھ
اُس نے رُک کر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا آصفؔ
کچھ گھروندے بھی تھے اُن اُونچے محلات کے ساتھ

ooo

نہ جانے کب کسی کو لوٹنا ہے
یہ گھر اِک عمر سے خالی پڑا ہے
دِیے کی لو تھی اور اُس پر مری آنکھ
مجھے بھی رات بھر جلنا پڑا ہے
میں چلتا ہوں مگر چلنا ہے مشکل
زمیں ہے یا کوئی زنجیرِ پا ہے
وہ اگلے موڑ پر شاید ملے بھی
پر اگلا موڑ کس نے دیکھنا ہے
محبت پھول جیسی نرم شئے ہے
پر اس کا راستہ کانٹوں بھرا ہے
سفر کی رات تھی اور یاد تیری
ستارہ گفتگو کرتا رہا ہے
یہی دیوانگی ہوتی ہے آصفؔ
ابھی رویا ابھی ہنسنے لگا ہے

ooo

ذرّہ حیدر آبادی

میری موت کی حسرت کیوں ہے آخر اِتنی نفرت کیوں ہے
تم نے بولا تھا مر جانا مر جانے پہ حیرت کیوں ہے
اِتنا تو سمجھا دو جاناں اِتنی پیار میں وحشت کیوں ہے
تم جانو گے تنہا ہو کر غم میں اِتنی لذت کیوں ہے
میرا نام بھی پھولوں جیسا پھر پھولوں سے چاہت کیوں ہے
ذرّہ تم سے پوچھ رہا ہے
تم کو سب سے اُلفت کیوں ہے

ooo

زندگی کو ترستے ہیں ہم دیکھئے کیسے مرتے ہیں ہم
ایسی حالت ہوئی عشق میں بات کرنے سے ڈرتے ہیں ہم
تجھ سے وعدہ ملن کا ہوا آئینے میں سنورتے ہیں ہم
اس نے بوسہ ہمارا لیا پھول جیسے نکھرتے ہیں ہم
چھوڑ جاتا ہے وہ ہی ہمیں جس بھی ظالم پہ مرتے ہیں ہم
محفلیں ذرّہ وہ نہ رہیں
شاعری اب بھی کرتے ہیں ہم

ooo

راشدِ اقبال

جو آئنہ سا سرِ راہ جگمگائیں ہم
کہیں قیام سے پہلے نہ ٹوٹ جائیں ہم

سخن سرا ہیں کہ سازینہ اُس کی گود میں ہے
رُکے وہ دستِ حنائی تو باز آئیں ہم

ملے نوید جو اُس کے وہاں پہ ہونے کی
چراغِ شامِ فسانہ اُٹھا نہ لائیں ہم

اگر کہیں سے وہ سیرِ چمن کو آ نکلے
نسیمِ صبح کی موجوں میں سرسرائیں ہم

اگر وہ پرسشِ صہبا اثر پہ مائل ہو
تو دِل کے داغ بڑے شوق سے دِکھائیں ہم

خدا علیم ہے یہ شوق اپنے بس کا نہیں
کہ اُس کے ناز یونہی عمر بھر اُٹھائیں ہم

ooo

یہ جو ہماری کوششِ نقش و نگار ہے
عجز و نیازِ جذبۂ بے اختیار ہے

یہ جو کبھی کبھار مَیں روتا ہوں اس قدر
لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی سوگوار ہے

آنا ضرور دیکھنا خِفّت نہ ہو کہیں
سب سے کہا ہوا ہے ترا اِنتظار ہے

زُہد و ورٰی کے باب میں دِل کو کہیں کہیں
خوفِ بلائے لمحۂ یک اِضطرار ہے

اس دِل کو آس ہی رہی راشدؔ کہ ایک بار
وہ بھی کہیں کہ لائقِ صد اعتبار ہے

ooo

سہولتِ یدِ بیضا انھیں کو زیبا ہے
جنھیں کیا گیا بالا ، انھیں کو زیبا ہے

جہانِ انفس و آفاق کھل گیا جن پر
ترے کلام کا چرچا انھیں کو زیبا ہے

جو بار بار درود و سلام بھیجتے ہیں
ثنائے خواجۂ بطحاؐ انھیں کو زیبا ہے

وہ جن کی قوتِ تخلیق تک رسائی ہو
یہ اعتکاف کی دُنیا اُنھیں کو زیبا ہے

جنھوں نے دیکھا ہو نیلے سمندروں کا سکوت
مزاجِ شورشِ دریا انھیں کو زیبا ہے

جنھیں کلام میں صد احتیاط ہو راشدؔ
یہ میناکاریٔ صہبا انھیں کو زیبا ہے

راشد حسین

تُو جو آتا ہے تو ڈھلتی ہے ترے ہجر کی شام
ورنہ آنکھوں میں پگھلتی ہے ترے ہجر کی شام

اِس میں در آئی ہے ہر خوبی ترے زُمرے کی
تیری صورت ہی بدلتی ہے ترے ہجر کی شام

جان لے تُو ، کسی بے سمت مسافر کی طرح
اب مرے خون میں چلتی ہے ترے ہجر کی شام

میں سمجھتا تھا کہ مونس ہے مری ، پہلے پہل
پھر کھلا مجھ سے بھی جلتی ہے ترے ہجر کی شام

میں اُنھیں دُور بھگانے میں لگا رہتا ہوں
جن اندھیروں سے بہلتی ہے ترے ہجر کی شام

غم نے کی ہے یہ عنایت جو ترے راشؔد پر
اُس پہ کیوں ہاتھ مسلتی ہے ترے ہجر کی شام

ooo

مقید پنچھیوں کی بے بسی اچھی نہیں لگتی
زمانے ! مجھ کو یہ بے چارگی اچھی نہیں لگتی

نہ جانے کیوں سراسر طنزیہ محسوس ہوتی ہے
مجھے تصویر میں اُس کی ہنسی اچھی نہیں لگتی

تو پھر یہ جان لو وہ ہونٹ میرے ہو نہیں سکتے
کہ جن ہونٹوں کو اپنی تشنگی اچھی نہیں لگتی

وہ جس کی راہ میں قربان کر ڈالا ہے ہر جذبہ
کہوں کیسے کہ اُس کی بے رُخی اچھی نہیں لگتی

صفِ ماتم بچھا رکھی ہے ہر سُو خشک پتّوں نے
مجھے موسم کی یہ غارت گری اچھی نہیں لگتی

یہ کاروبار سارا منحصر ہے خوابنا کی پر
حقیقت کی کسی کو آگہی اچھی نہیں لگتی

یہ لازم ہے کہ راشؔد بند کر دے اپنا میخانہ
ترے اپنوں کو تری بے خودی اچھی نہیں لگتی

ooo

راؤ وحید اسؔد

کیا آنکھ سے تمہاری ستارا نکل پڑا
صدمے میں شہر سارے کا سارا نکل پڑا

دریا میں صرف پانی کے آنے کی دیر تھی
اِک جست میں وہاں سے کنارا نکل پڑا

نکلی تھی پہلے جسم کے خستہ مکاں سے اینٹ
پھر اُس کے بعد جسم ہی سارا نکل پڑا

شب بھر کا بوجھ ڈھوتا جھکا چاند دِن کی سمت
گٹھڑی کا بوجھ سر سے اُتارا نکل پڑا

پہنچا ہی تھا ابھی میں کہانی کے موڑ پر
پانی کسی کی آنکھ سے کھارا نکل پڑا

یہ آسماں گرے گا کسی دِن دھڑام سے
نیچے سے جب زمیں کا سہارا نکل پڑا

○○○

تمہاری ذات کا حصہ بنا دیا گیا ہوں
اسی لیے تو میں تجھ سا بنا دیا گیا ہوں

کہاں وگرنہ اُترتی یہ برف بالوں میں
کسی کے غم میں، مَیں بوڑھا بنا دیا گیا ہوں

عجیب ڈھب سے لکھا ہے مرے مصنف نے
میں ہاؤ ہُو کا مقالہ بنا دیا گیا ہوں

بدن میں بھر کے مرے ریت نارسائی کی
میں دیکھ پیاس کا دریا بنا دیا گیا ہوں

سجا کے سَر پہ مرے تاج آدمیّت کا
مثالِ کعبہ و قبلہ بنا دیا گیا ہوں

عجیب شے ہے محبت کی سلطنت بھی اسؔد
غرورِ شاہ سے گریہ بنا دیا گیا ہوں

○○○

ایک طوفاں اُٹھا کے جاؤں گا
اب تجھے میں بُھلا کے جاؤں گا

پھونک ڈالوں گا یاد کے پتّے
دِل کی بستی جلا کے جاؤں گا

تنگ کرتے ہیں تیرے خواب مجھے
ان سے دامن چھڑا کے جاؤں گا

یہ محبت مرا حوالہ ہے
میں محبت جگا کے جاؤں گا

جو بچے ہیں تمہاری یادوں کے
سب کبوتر اُڑا کے جاؤں گا

بعد میرے مرا حوالہ ہو
نظم ایسی سنا کے جاؤں گا

آج اپنی غزل کے مصرع میں
تیری آنکھیں بنا کے جاؤں گا

شام ، پیپل ، کنواں ، پرند اور تم
سارے منظر چُرا کے جاؤں گا

رضیہ کاظمی

پرے یقیں کی حدوں سے نہ کیوں گماں ہو جائے
بنا سبب ہی اگر کوئی مہرباں ہو جائے

وہ قید کیا نہیں بہتر تھی اس رہائی سے
درِ قفس جو کھلے کارواں رواں ہو جائے

جو روندتے رہے ہم یوں ہی آسمانوں کو
یہ کہکشاں نہ کبھی گردِ کارواں ہو جائے

شرف مِلا یہ ترے در پہ باریابی سے
زمیں پہ پیر جو رکھ دیں تو آسماں ہو جائے

کھڑے ہیں کتنے طلب گار تیری چوکھٹ پر
وہ خوش نصیب ہے تو جس پہ مہرباں ہو جائے

الٰہی جلد دُعاؤں میں دے اثر ورنہ
ہے عن قریب یہ عالم دُھواں دُھواں ہو جائے

ہمارے اپنوں نے ہی اس طرح ستایا ہے
رضیّہ کہنے پہ آئیں تو داستاں ہو جائے

OOO

کہاں تھے ہم ، کہاں پائے گئے ہیں
کھلونے دے کے بہلائے گئے ہیں

لگے دھبّا سفیدی پر نہ ان کے
ابھی کپڑے بدلوائے گئے ہیں

کبھی پایا نہ محفل میں تقرّب
ہمیشہ در سے اُٹھوائے گئے ہیں

تمہارے جیسا سنگِ دِل نہ دیکھا
سدا فولاد پگھلائے گئے ہیں

خرد نے ہر گھڑی بخیہ گری کی
گریباں چاک ہی پائے گئے ہیں

نہ ہو گی چند جرعوں سے تسلی
نہ جانے کب سے ترسائے گئے ہیں

ہوئے خود دیس میں پردیسیوں سے
کہ جوں باہر سے منگوائے گئے ہیں

کبھی ہم بھی چلے تھے سمتِ منزل
مگر راہوں میں بھٹکائے گئے ہیں

زمینیں تم نہ اُستادوں کی چُھونا
رضیّہ کب سے سمجھائے گئے ہیں

OOO

رُستم نامی

زمین کم ہے یہاں آسمان تھوڑا ہے　　توقعات سے تیرا جہان تھوڑا ہے
بس اِک ہمارے ہی سر پر ہے اس کا دستِ ستم　　فقط تجھی سے یہ دِل بدگمان تھوڑا ہے
لگائے رکھا ہے بس یوں ہی میں نے جی ورنہ　　ترا جہاں مرے شایانِ شان تھوڑا ہے
ذرا سا حوصلہ رکھنے کی بات ہے نامیؔ
یہ کوہِ غم ہے کوئی آسمان تھوڑا ہے

ooo

ہمارے بھی ذرا حالات پھرتے　　وہ پھرتا جب تو پھر دِن رات پھرتے
کہاں تک صبر کا پتھر اُٹھاتے　　کہاں تک ہم لیے جذبات پھرتے
کبھی تو خود کو بھی آتے میسر　　کبھی ہم بھی ہمارے ساتھ پھرتے
نہیں پھرتے تھے ہم پھرنے سے لیکن　　تمہارے بعد کس کے ساتھ پھرتے
جھمیلوں سے ہمیں فرصت جو ملتی　　کبھی گلگت کبھی گلیات پھرتے
تو پھر اپنا نشاں بھی مِل نہ سکتا　　اگر ہم بہرِ تحقیقات پھرتے
نہیں تھا یہ نصیبوں میں کہ نامیؔ
لیے ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ پھرتے

ooo

سجاد حیدر

حرمتِ عشق کے اِدراک کی خواہش نہ کرے
اب کوئی دامنِ صد چاک کی خواہش نہ کرے

ہو گا کیا حشر بتا سوزِ عزاخانہ کا
دِل اگر دیدۂ نمناک کی خواہش نہ کرے

یہ ضروری تو نہیں دار و رسن کے ڈر سے
کوئی بھی لہجۂ بے باک کی خواہش نہ کرے

وہ جو ملبوسِ قناعت پہ ہی صابر ٹھہرے
وہ شہنشاہ کی پوشاک کی خواہش نہ کرے

جس کو کرنا ہے سفر عالمِ اعلیٰ کی طرف
کیسے یہ جسم پھر اُس خاک کی خواہش نہ کرے

دِل کی جاگیر میں آنا ہے تو دِل سے آؤ
یہ تو لوٹی ہوئی اَملاک کی خواہش نہ کرے

یہ قفس عشق کا ایسا ہے اگر طائرِ دِل
اس میں آجائے تو افلاک کی خواہش نہ کرے

ooo

نیند ہے گہرا سمندر تو کنارا خواب ہے
اے غریقِ بحرِ شب تیرا سہارا خواب ہے

اِک فسوں سازی ہو جیسے تیری قربت کی گھڑی
اِک عجب احساس جو سارے کا سارا خواب ہے

آنکھ سے اَشکوں کی صورت سارے منظر بہہ گئے
جو بچا دامن میں اس کے وہ تمہارا خواب ہے

یونہی تو پھیلی نہیں ہے زندگی کے بن میں آگ
جس نے دہکایا نفس کو وہ شرارہ خواب ہے

کشتیٔ ہجراں کا رُخ اب کونسی جانب کروں
اِک ستارہ تیرا وعدہ ، اِک ستارہ خواب ہے

کھول آنکھیں، مجھ کو آئے دِل کے ہاتف کی صدا
جو مسلسل کہہ رہا ہے ہر نظارہ خواب ہے

ربِ عرفانِ سحر یہ کس بشارت کے لیے
اِک تیقن کی طرح دِل میں اُتارا خواب ہے

ooo

کھلتے رنگ اُٹھائے اس کی یادوں کو تصویر کیا
ایک گلابی پھول سے اس کی باتوں کو تصویر کیا

اس کے رُخ کا تل اور دِیپ بنایا خالی کاغذ پر
جب بھی اُس کا رستہ تکتی راتوں کو تصویر کیا

اِک کاغذ کی کشتی چھوڑ کے میں نے چلتے پانی میں
بحرِ شب میں ڈوبنے والے وعدوں کو تصویر کیا

بن بادل کے نیل گگن کو گھولا نیلے پانی میں
یوں بھی میں نے تنہائی کے لمحوں کو تصویر کیا

ندیا ایک گزاری میں نے صحراؤں کے سینے سے
میں نے جب بھی ان آنکھوں کے اَشکوں کو تصویر کیا
مہندی کی اِک خالی تھالی، ٹکڑے کانچ کی چُوڑی کے
یوں بھی اِک فنکار نے خالی بانہوں کو تصویر کیا

ooo

داستاں لکھنے کی خاطر داستاں ہونے کو ہوں
اَشک کی تفسیر میں رنگِ فغاں ہونے کو ہوں
نالۂ گمنام میں تو گنبدِ صامت میں تھا
ربِ گریہ کا کرم ہے جو بیاں ہونے کو ہوں
مطمئن تھا فکرِ بیش و کم سے ہو کر بے نیاز
وائے قسمت واقفِ سود وزیاں ہونے کو ہوں
اے مرے ادراک آ کر جادۂ حیرت پہ دیکھ
کونسی منزل کی جانب میں رواں ہونے کو ہوں
میں نے اَشکوں کا بہاؤ دِل کی جانب کر دیا
ہمرکابِ آبِ بحرِ بے کراں ہونے کو ہوں
لطفِ وردِ یار مجھ پہ ہو رہا ہے منکشف
دھڑکنوں میں بھی تمہارا ہم زباں ہونے کو ہوں
اِک خطِ وحدت پہ ظاہر اور باطن آ گئے
اب کسی ساعت میں بھی خود پر عیاں ہونے کو ہوں
میں کہ اِک ذرّہ تھا لیکن ان کے قدموں کے طفیل
اس زمیں سے اُڑ کے جزوِ کہکشاں ہونے کو ہوں
اپنے حصّے کا اُجالا کر چکا سجّاد میں
اب کوئی بھی غم نہیں ہے جو دھواں ہونے کو ہوں

ooo

تمہارے ہجر کے لمحے شمار کرتے ہوئے
یہ وقت گزرے مرے دِل پہ وار کرتے ہوئے
پھر اس حیات میں کچھ اور ہی کشش ہو گی
کبھی گزار اُسے انتظار کرتے ہوئے
بُنا ہے ہم نے تو اس خلعتِ قضا کو بھی
لباسِ عمرِ رواں تار تار کرتے ہوئے
بڑا سکوں ہے ترے درد کی سرائے میں
ہُوا ہوں خوش ترا غم اِختیار کرتے ہوئے
مرے سخن کی عدالت میں خواب آئے مرے
عجیب رنگ سے چیخ و پکار کرتے ہوئے

ooo

میں بے سکون گردشِ حالات میں نہیں
لیکن عنانِ وقت مرے ہاتھ میں نہیں
رہتا ہے میرے گرد کسی نام کا حصار
ورنہ یہاں پہ کون مری گھات میں نہیں
صد شکر میں ہوں اس کے کرم کی پناہ میں
صد شکر میں گھرا ہوا آفات میں نہیں
یہ تیری ذات ہے جو مجھے معتبر کرے
خامی وگرنہ کیا کیا مری ذات میں نہیں
میں اِک نگینِ مخزنِ کوہِ یقین ہوں
میں منتشر گمان کے ذرّات میں نہیں
سجّاد راہِ عشق میں تو آزما مجھے
رنگِ نفی کہیں مرے اثبات میں نہیں

سرور ارمان

زمانوں سے درِ امکان پر رکھے ہوئے ہیں — چراغوں کی طرح طوفان پر رکھے ہوئے ہیں
فضاؤں میں مہک جلنے کی بو پھیلی ہوئی ہے — کسی نے پھول آتش دان پر رکھے ہوئے ہیں
ذرا سا بھی گماں تیری شباہت کا تھا جن پر — وہ سب چہرے مری پہچان پر رکھے ہوئے ہیں
خوشی کو ڈھونڈنا ممکن نہیں اس کیفیت میں — کچھ ایسے سانحے مسکان پر رکھے ہوئے ہیں
کوئی تیری پرستش کی نہیں صورت نکلتی — ہزاروں کفر اک ایمان پر رکھے ہوئے ہیں
شکم سیری سے پہلے لمحہ بھر کو سوچ لینا — ہمارے خواب دسترخوان پر رکھے ہوئے ہیں
کسی کے روز و شب بکنے کی قیمت چند لقمے — تو کیا وہ بھی ترے احسان پر رکھے ہوئے ہیں

انھی درباریوں پر مہرباں ہے تاجِ شاہی
جو نظریں مسندِ سلطان پر رکھے ہوئے ہیں

○○○

سرکشی کو جب ہم نے ہمرکاب رکھنا ہے — ٹوٹنے بکھرنے کا کیا حساب رکھنا ہے
ایک ایک ساعت میں زندگی سمونی ہے — ایک ایک جذبے میں اِنقلاب رکھنا ہے
رات کے اندھیروں سے جنگ کرنے والوں نے — صبح کی ہتھیلی پر آفتاب رکھنا ہے
ہم پہ اُس سے واجب ہیں کوششیں بغاوت کی — تم نے جس قبیلے کو کامیاب رکھنا ہے
رکھ دو ہم فقیروں کی اِس کشادہ جھولی میں — اپنی بادشاہی کا جو عذاب رکھنا ہے
تم تو خود زمانے میں جبر کی علامت ہو — تم نے جبر کیا زیرِ احتساب رکھنا ہے

شہرِ بے اَماں ہم نے ، نقدِ جاں لٹا کر بھی
تیرے ہر دریچے پر کل کا خواب رکھنا ہے

○○○

حروفِ اوراق بجھ گئے ہیں، نقوشِ دیوار مٹ گئے ہیں
محبتیں دفن ہو گئی ہیں ، وفا کے آثار مٹ گئے ہیں

کچھ اب سپردِ قلم کریں بھی تو لائیں وہ بانکپن کہاں سے
کہ سب تصاویر جل گئی ہیں کہ سارے شہکار مٹ گئے ہیں

وہی شب و روز کی گھٹن ہے، وہی اداسی چمن چمن ہے
یہ آبلہ پائی بے ثمر ہے کہ ہم تو بے کار مٹ گئے ہیں

غریب خانوں میں زندگی کا گمان ہوتا تھا جن کے دم سے
وہ دھڑکنیں آج رک گئی ہیں وہ غم سرِ دار مٹ گئے ہیں

وہ طائرانِ کمال جن کو غرور اپنی اُڑان پر تھا
چھپا کے منقار سو گئے ہیں لٹا کے گھر بار مٹ گئے ہیں

نگاہِ تاریخ دیکھ ان کو ، ضمیرِ عالم پکار ان کو
طلب کی دشوار رہ پہ جو لوگ چل کے ہر بار مٹ گئے ہیں

پکارتے تھے اٹھا کے بازو کبھی جو اے صبحِ نور تجھ کو
اُفق کی چلمن سے دیکھ تیرے وہی طلب گار مٹ گئے ہیں

ooo

سعداللہ شاہ

سوچتے سوچتے اس دنیا کو تھک جاتا ہوں
میں تری ذات سے نکلوں تو بھٹک جاتا ہوں

رنگ اُڑتے ہوئے آتے ہیں کسی تتلی پر
بادِ خوشبو سے رگ و جاں میں مہک جاتا ہوں

آگ لگتی ہے گلابوں میں سرِ شامِ شباب
عارضِ وقت پہ بھی میں تو دہک جاتا ہوں

ایک ذرّے پہ ستارے کا گماں ہوتا ہے
اس رخِ مہر سے میں بھی تو مہک جاتا ہوں

اک سکندر ہوں کہ رہتا ہوں سرِ آبِ حیات
بے ثباتی میں کلی بن کے چٹک جاتا ہوں

میرا دل ہے کہ سمندر سا کوئی بپھرا ہوا
کیا ہے گر آنکھ سے تھوڑا سا چھلک جاتا ہوں

سعؔد یہ میرا سخن ایک امانت ہی تو ہے
میں جو ہوتا ہوں ثمر بار لچک جاتا ہوں

ooo

لاکھ دشمن سہی وہ دوست نما ، آ جائے
گل تو بے بس ہے اگر بادِ صبا آ جائے

ایک ہی جیسے چلے آتے ہیں موسم سارے
ایک حسرت کہ کوئی اس کی جگہ آ جائے

کیا کرے کوئی اگر رات کی خاموشی میں
یک بیک دل کے دھڑکنے کی صدا آ جائے

اتنا کافی ہے کہ در بند کیے دیتے ہو
کھڑکیاں کھول کے رکھنا کہ ہوا آ جائے

دیکھ اے دل! وہ چلے آتے ہیں میری جانب
اب ترا ضبط نہ ٹوٹے تو مزا آ جائے

ہم نے سوچا تھا رہِ زیست میں ہر منزل پر
خوب سوئیں گے ذرا خواب سرا آ جائے

خود ہی کھل جائے گا جو کچھ ہے گرہ میں اپنی
وہ اگر بن کے کبھی مصرع طرح آ جائے

سعد یہ بات مرے دل میں سمائی تو بنی
منزلیں کیسی جہاں راہِ وفا آ جائے

ooo

سعید احمد اختر

پھینکے ہوئے بے کار کھلونے کی طرح ہوں
میں باغ کے اُجڑے ہوئے گوشے کی طرح ہوں
تو دِل میں اُترتی ہوئی خوشبو کی طرح ہے
میں جسم سے اُترے ہوئے کپڑے کی طرح ہوں
کچھ اور بھی دِن مجھ کو سمجھنے میں لگیں گے
میں خواب میں دیکھے ہوئے رستے کی طرح ہوں
سایہ سا یہ کس چیز کا ہے میرے وطن پر
میں کیوں کسی سہمے ہوئے قصبے کی طرح ہوں
میں ماں ہوں ستائی ہو حد درجہ بہو کی
اور بیٹے پہ آئے ہوئے غصے کی طرح ہوں
اب تو کسی مہکار کی یادوں کا سفر ہے
اور میں کسی بھولے ہوئے قصے کی طرح ہوں
جس میں کوئی در ہے نہ دریچہ، نہ مکیں ہے
اُس گھر پہ لگائے ہوئے پہرے کی طرح ہوں
کیا ہو گی تلافی مرے نقصان کی اختر
میں قید میں گزرے ہوئے عرصے کی طرح ہوں

ooo

رُکو ساتھی ، شگون اچھا نہیں ہے
کسی بھی پیڑ کا سایہ نہیں ہے
لڑیں گے اور جرأت سے سپاہی
ابھی میرا علَم پہنچا نہیں ہے
اسے محشر سے پہلے مت جگاو
بچارا عمر بھر سویا نہیں ہے
تمہارا حسن تو بے مثل تھا ہی
جفا میں بھی کوئی تم سا نہیں ہے
اُسے خود اپنا رستہ ڈھونڈنا ہے
اُسے جانے دو وہ بچہ نہیں ہے
جدھر دیکھو اُدھر سڑکیں ہیں لیکن
کسی جانب کوئی رستہ نہیں ہے
خدا کو ، خود کو اور اُس جانِ جاں کو
بہت ڈھونڈا مگر پایا نہیں ہے
ابھی منہ دیکھنے مت جاؤ ، اختر
کہ اُس دھڑ پر ابھی چہرہ نہیں ہے

ooo

سلیم شہزاد

بچھڑتے وقت بھی دونوں کو کچھ گلہ نہ ہوا
وہ بے وفا ہے کہ میں ہم سے فیصلہ نہ ہوا

نہ جانے کون سا جادو تھا تیری آنکھوں میں
بچھڑ کے تجھ سے تری قید سے رہا نہ ہوا

شبِ وصال میں صحبت رہی ہے ہجراں سے
وِصال یار کا مجھ کو تو حوصلہ نہ ہوا

ہر ایک صبح اُبھرتا ہے شب کے نیزے پر
عجب ہے سجدہ جو سورج سے بھی ادا نہ ہوا

تمام عمر گراتا رہا ہوں میں آتش
مگر یہ دُکھ کا سمندر کبھی ہوا نہ ہوا

گزر گئی کسی تنہا گلی میں عمر سلیمؔ
کسی مکان سے اپنا تو رابطہ نہ ہوا

خود اپنے عشق میں معشوق ہو گئے شہزادؔ!
ہمارے بعد کوئی صاحبِ اَنا نہ ہوا

OOO

میں نہیں جانتا کیا چیز ہے نفرت کرنا
مجھ کو وِرثے میں مِلا صرف محبت کرنا

اپنی آنکھیں تو فقط اِس لیے تخلیق ہوئیں
حسن کو کھوجنا ، چہروں کی تلاوت کرنا

جو روایت ہے وہی فیصلہ سردار کرے
اپنا تو حق تھا قبیلے سے بغاوت کرنا

جو مجھے چھوڑ گئی اپنی اَنا کی خاطر
یاد کرنا ہے اُسے ، خود کو ملامت کرنا

لذتِ درد ہی کافی ہے تعلق میں مجھے
اب محبت کی نہیں غم کی سخاوت کرنا

وہ تو بس خواب میں اُلجھی تھی مرے ساتھ سلیمؔ!
خواب تھا خواب کی کیا اُس سے شکایت کرنا

OOO

سلیمان جاذب

اپنے قابو میں دِل نہیں تب سے
تجھ کو دیکھا ہے اِک نظر جب سے
تیرا انداز ہر کسی سے الگ
اور مرا راستہ جدا سب سے
پھول مجھ کو وہ خوش نما سا لگے
چُھو گیا جو ترے حسیں لب سے
بات سنتا نہیں یہاں کوئی
بات کرتا ہے اب نئے ڈھب سے
شہر سنساں ہے اس طرح جاذبؔ
چاند رُوٹھا ہو جس طرح شب سے

OOO

الوداع اس کو یوں کہا میں نے
خود سے خود کو جدا کیا میں نے
فیصلہ ماننا ہے اب دِل کا
کر لیا ہے یہ فیصلہ میں نے
مشکلوں سے جسے قریب کیا
عجلتوں میں گنوا دیا میں نے
کتنے نزدیک سے اسے دیکھا
درمیاں رکھ کے فاصلہ میں نے
ایک چپ کام کر گئی جاذبؔ
جیسے سب کچھ ہی کہہ دیا میں نے

OOO

سمیع صدیقی

ہاتھوں میں وہ کمالِ ہنر چاہتے ہیں لوگ
ہر جیب میں ہوں لعل و گوہر چاہتے ہیں لوگ

جو شاخ اس طرف ہے اسی گھر کا حق ہے وہ
جو اُن کا حق نہیں وہ ثمر چاہتے ہیں لوگ

ہم کو خدا وطن سے کہیں دُور بھیج دے
ہو جائیں گویا ملک بدر چاہتے ہیں لوگ

یہ کائنات اُن کے اِشارے پہ چل سکے
کچھ ایسا اقتدار و اثر چاہتے ہیں لوگ

پہنیں نیا سا جسم اُتاریں پرانا جسم
ممکن نہیں ہے ایسا مگر چاہتے ہیں لوگ

رعنائیاں تمام ہوں آسائشیں تمام
روئے زمیں پہ خُلد کا گھر چاہتے ہیں لوگ

وہ رشکِ ماہتاب ہو وہ رشکِ صد گلاب
ایسا حسیں شریکِ سفر چاہتے ہیں لوگ

اِک طفلِ شیر خوار کی مانند ہیں سمیعؔ
دامن میں اپنے شمس و قمر چاہتے ہیں لوگ

○○○

چل پڑے اِک راہ پر بادل کا ٹکڑا اور میں
وہ تو جا کر بادلوں سے مِل گیا تھا اور میں؟

دونوں مِل کر رو دیے تھے غم کا صحرا اور میں
رات ہم ملنے گئے تھے میرا سایا اور میں

وہ کبھی دِل سے نہ نکلی میں حصارِ عشق سے
کیسے زندانی ہوئے تیری تمنّا اور میں

کوئی بادل ہی وہاں برسا نہ مجھ کو وہ ملا
رہ گئے پیاسے کے پیاسے تپتا صحرا اور میں

وہ تو یوں کہیے مجھے اس پر نہیں تھا اختیار
ورنہ ایسی بے وفا دُنیا میں آتا اور میں

اب تو لے دے کہ مرا سارا اِثاثہ ہے یہی
کشتیٔ عمرِ رواں ، یادوں کا دریا اور میں

یہ وہ تنہائی کہاں ہے جس کو تنہائی کہیں
ایک ہی کمرے میں ہیں اب گھپ اندھیرا اور میں

اب تو تنہائی میں بھی اِک جشن رہتا ہے سمیعؔ
اَن گنت بیتے ہوئے لمحوں کا میلہ اور میں

سہیل عباس

بکھر ہی جائے گا ایک دن یہ ربطِ رُوح وتن
ہوا کے ساتھ بندھا ہے حباب سا بندھن
نواحِ جان ہے روشن مثالِ کاہکشاں
چمک رہا ہے ترے غم سے آرزو کا گگن
ترے سوا مجھے کچھ بھی نہیں بھلا لگتا
مجھے تو زندگی میں ہے بس ایک تیری لگن
میں اپنے آپ میں رہتا ہوں اب اُداس اُداس
سکون لینے نہیں دیتی یہ دکھوں کی چبھن
نہ آیا ایک کا بھی خواب رُت کا شہزادہ
تصوّرات میں گو لڑکیاں بنیں دلہن
اُڑا کے لے گئی آنچل ہوا زمانے کی
سمے نے چاک کیا خواہشوں کا پیراہن
وہ نخل خشک ہوں میں دکھ کے گلستاں میں سہیل
جلا جلا گئی جس کو ہوائے غم کی جلن

ooo

صدق اور مہر کے سو باب سجا کر رکھتا
بہرِ اُلفت کئی آداب سجا کر رکھتا
مہرباں ہو کے بلاتا تُو اگر مجھ کو کبھی
پاؤں میں تیرے کئی خواب سجا کر رکھتا
کرتا صحراؤں کو میں آگ سے اپنی روشن
دشت میں دیدۂ پُر آب سجا کر رکھتا
تیرے قدموں میں بچھا دیتا جواہر پارے
ایک اک گوہرِ نایاب سجا کر رکھتا
تو کبھی آتا جو گھر میرے تو ہر رستے میں
اطلس و ریشم و کمخواب سجا کر رکھتا
سنگلاخ اتنی طبیعت تھی مری بچپن سے
خود رہِ عشق میں گرداب سجا کر رکھتا
جو گزرتی تھی مرے دل پہ وہ کُھل کر کہتا
دردِ دل برسرِ احباب سجا کر رکھتا
دیکھتا چھت پہ اُسے میں جو کبھی سویا ہوا
جسم پر چادرِ مہتاب سجا کر رکھتا
جو وہ بہہ کر تری بستی کی طرف جا نکلیں
پھول ہی پھول سرِ آب سجا کر رکھتا
رکھتا میں دیدۂ بےخواب ترے پاؤں میں
یاد سے یہ دلِ بے تاب سجا کر رکھتا
ایک اِک سطر میں، مَیں تارے پرو لاتا سہیلؔ
تیرے خط کے کئی القاب سجا کر رکھتا

اب تو یہی دعا ہے کہ گھر خوش رہے وہ شخص
ہم کو بھلا کے اپنے نگر خوش رہے وہ شخص

ہم اس کو بار بار نہ یاد آئیں اس طرح
ہو جس جگہ بھی ،شام و سحر خوش رہے وہ شخص

ہم کو بس ایک اس کی مسرت سے ہے غرض
دنیا دکھی ہو لاکھ مگر خوش رہے وہ شخص

ہموار سطحِ آب ہو اس کے لیے سدا
اس کو ملے نہ کوئی بھنور خوش رہے وہ شخص

اس کو کہا تھا پہلے بھی اک بار اور پھر
کہتے ہیں آج بارِ دگر خوش رہے وہ شخص

اس کو سفر حضر میں مسرت ملے سہیل
وقتِ قیام و وقتِ سفر خوش رہے وہ شخص

دیتا ہے بار بار دُعا ایک ''اپنے گھر''
تیرا سہیلِ شہر بدر''خوش رہے وہ شخص''

ooo

ہیں جو غزلوں کی طرح سے مرے دیوان میں پھول
کب بھلا ہوں گے کہیں ایسے گلستان میں پھول

سایۂ ظلم میں پروان نہیں چڑھتی بہار
خار ہو جاتے ہیں آ کر کفِ سلطان میں پھول

مجھ میں اور آپ میں گر فرق ہے تو اتنا ہے
خار دامن میں مرے آپ کے دامان میں پھول

کون خوشبو کی طرح پاس سے کمرے میں گیا
کس کے آنے سے کھلے جاتے ہیں گلدان میں پھول

سرد ہو سکتا نہیں موت سے بازارِ حیات
کھلنے سے باز نہیں آئیں گے شمشان میں پھول

اپنے محسن کو تو بازار میں افسردہ نہ کر
دے نہ اس طرح سے تو چشمِ نگہبان میں پھول

دل کا گلزار بہاروں کا نہیں ہے محتاج
اس کے آنے ہی سے کھل سکتے ہیں اس جان میں پھول

میرے کانوں میں مہک اُٹھی ہیں باتیں اس کی
اس کے ہونٹوں سے جھڑے اور گرے کان میں پھول

ہیں ترے لمس کے محتاج چمن کے غنچے
تو اگر چُھو لے تو کھل جائیں گے اک آن میں پھول

اچھی قدروں کا پرستار نہیں ہے کوئی
جل کے اب راکھ ہوئے ہیں دلِ انسان میں پھول

کون بتلائے گا اس کی مجھے تعبیر سہیل
اس نے بھیجے ہیں مرے خوابِ پریشان میں پھول

ooo

سیّد اذلان شاہ

کسی کے نام پہ ننھے دِیے جلاتے ہوئے　　خدا کو بھول گئے نیکیاں کماتے ہوئے
انھیں عزیز ہے جینا جو جی رہے ہیں یہاں　　مذاق بن کر خود اپنا مذاق اُڑاتے ہوئے
وگرنہ بات ہماری سمجھ سے باہر تھی　　یہ عشق ہو گیا بس رُوٹھتے مناتے ہوئے
ہماری واپسی آساں نہیں یقین مانو　　یہاں تک آئے ہیں ہم کشتیاں جلاتے ہوئے
میں گھِر گیا ہوں یہاں پر بہت سے اپنوں میں
ترے لیے سبھی کچھ داؤ پر لگاتے ہوئے

OOO

جب تک ترا احسان اُٹھانے نہیں لگتے　　ہم ہاتھ سے کشکول گرانے نہیں لگتے
ہے عشق کے ماروں کی یہی ایک نشانی　　جتنے بھی پرانے ہوں پرانے نہیں لگتے
ان کے لیے ناکام محبت بھی ہے تمغہ　　یہ لوگ کسی طور ٹھکانے نہیں لگتے
جب خاک مِلی خاک میں تب آیا سمجھ میں
لمحوں کی مسافت میں زمانے نہیں لگتے

OOO

دوسرا رُخ نہیں جس کا اسی تصویر کا ہے　　مسئلہ بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کا ہے
چند قدموں سے زیادہ نہیں چلنے پاتا　　جس کو دیکھو وہی قیدی کسی زنجیر کا ہے
جو بھی کرنا ہے فقط دِل کی تسلّی کے لیے　　وقت تحریر کا ہے اور نہ تدبیر کا ہے
تم محبت کا اسے نام بھی دے لو لیکن　　یہ تو قصّہ کسی ہاری ہوئی تقدیر کا ہے
یہ جو چلنے نہیں پاتے تری جانب دراصل
جلدی جلدی میں کہیں ڈر ہمیں تاخیر کا ہے

OOO

سیّد گلزار بخاری

اُس کی آنکھیں مجھ کو دیتی ہیں اِشارہ دُور سے
رازداں میرا ہوا ہے اِک ستارہ دُور سے

ذہن کہتا ہے کہ شعلے سے نہ دامن جل اُٹھے
جی کو خوش آتا نہیں اُس کا نظارہ دُور سے

اُس کے گرنے کا ہے غم بھی، تم کو اپنی فکر بھی
کس طرح دیوار کو دو گے سہارا دُور سے

میں نے کب خود آگ بھڑکائی ہے اپنے صحن میں
اُڑ کے آیا ہے مرے گھر میں شرارہ دُور سے

پاس جا کر اس طرح ٹوٹا فسوں اُس چاند کا
شوق کہتا ہے اُسے دیکھوں دوبارہ دُور سے

کیا قصور اُس کا تری آواز پہنچی ہی نہیں
بھیڑ میں گلزؔار کو تُو نے پکارا دُور سے

ooo

محبت کے سوا حرف و بیاں سے کچھ نہیں ہوتا
ہوا ساکن رہے تو بادباں سے کچھ نہیں ہوتا

چلو تو مصلحت یہ کہہ کے پاؤں تھام لیتی ہے
وہاں جانا بھی کیا، حاصل جہاں سے کچھ نہیں ہوتا

مسلسل بارشیں بھی سبزہ و گل لا نہیں سکتیں
زمیں جب بے نمو ہو، آسماں سے کچھ نہیں ہوتا

تلافی کے لیے درکار ہے آئینہ سازی بھی
شکستِ شیشہ پر ذِکرِ زباں سے کچھ نہیں ہوتا

خلا میں تیراندازی سے کیا گلزؔار پائیں گے
میسر اس جنونِ رائیگاں سے کچھ نہیں ہوتا

ooo

شاہین عباس

میاں عشق میں اِلتجا اپنی اپنی
سکوت اپنا اپنا صدا اپنی اپنی

چراغو کہو تو بدل لیں کسی شب!
ہم اِک دوسرے سے جگہ اپنی اپنی

جو خواب اپنے اپنے نہیں دیکھتے تھے
اب آنکھیں تو دیکھیں ذرا اپنی اپنی

سو ہم ایک دُوجے میں گم ہو گئے ہیں
ہمیں کاٹنا تھی سزا اپنی اپنی

بھروسا نہ کیجئے گا اَب داستاں پر!
فنا اپنی اپنی بقا اپنی اپنی

ہمیں نے اکیلے کیا ہے زمیں کو
اُڑاتے ہوئے خاکِ پا اپنی اپنی

بہت شوق تھا نا ، سفر اِبتدا ہو!
سو اَب دیکھیے اِنتہا اپنی اپنی

یہ تاریخ والے ــــ یہ تاخیر والے
اَدا کر رہے ہیں قضا اپنی اپنی

ooo

زمیں کا آخری منظر دِکھائی دینے لگا
میں دیکھتا ہوا ، پتّھر دِکھائی دینے لگا

وہ سامنے تھا تو کم کم دِکھائی دیتا تھا
چلا گیا تو برابر دِکھائی دینے لگا

نشانِ ہجر بھی ہے وصل کی نشانیوں میں
کہاں کا زخم ، کہاں پر دِکھائی دینے لگا

وہ اِس طرح سے مجھے دیکھتے ہوئے گزرا
میں اپنے آپ کو بہتر دِکھائی دینے لگا

تجھے خبر ہی نہیں رات معجزہ جو ہوا
اَندھیرے کو تجھے چُھو کر دِکھائی دینے لگا

کچھ اِتنے غور سے دیکھا چراغ جلتا ہوا
کہ مَیں چراغ کے اَندر دِکھائی دینے لگا

پہنچ گیا تری آنکھوں کے اُس کنارے تک
جہاں سے مجھ کو سمندر دِکھائی دینے لگا

میں سَر ہلاتا گیا اور قدم اُٹھاتا گیا
سنائی دیتا ہوا گھر دِکھائی دینے لگا

میں اَندرُوں سے بہت بچ کے باہر آیا تھا
اور اَندرُوں تھا کہ باہر دِکھائی دینے لگا

شفیق آصف

اَبد کے منظروں کی اِبتدا ہونے لگی ہے　　ہماری حیرتوں کی اِنتہا ہونے لگی ہے

بکھرتے جارہے ہیں آنکھ سے سارے مناظر　　حریمِ جاں میں برپا کربلا ہونے لگی ہے

نہیں معلوم کیسے شہر میں ہے اب ٹھکانہ　　یہاں تو زندگی بھی اِک سزا ہونے لگی ہے

ہوئے سرسبز موسم سے تمہارے پھر مراسم　　تمہاری ذات سے خوشبو رہا ہونے لگی ہے

نجانے کون سی منزل پہ آ پہنچے ہیں آصفؔ
یہاں تو بے وفاؤں سے وفا ہونے لگی ہے

OOO

زندگی کا اِستعارہ خواب ہے　　چاہتوں کا گوشوارہ خواب ہے

مسکراتا ہے جو اُس کی آنکھ میں　　دیکھ لینا ، وہ ہمارا خواب ہے

جی رہے ہیں اِک مسلسل خواب میں　　شب اَسیروں کا سہارا خواب ہے

منفعت کی آنکھ سے تم دیکھنا　　ہر حقیقت کا خسارا خواب ہے

دیکھتے ہیں جس کو آصفؔ روز و شب
وہ ہمارا یا تمہارا خواب ہے

OOO

موجۂ ادراک میں رہتا ہوں میں　　دیدۂ نمناک میں رہتا ہوں میں

دار کے موسم ہیں میرے منتظر　　حلقۂ بیباک میں رہتا ہوں میں

دھول سی اُڑتی ہے میرے ہر طرف　　اور خس و خاشاک میں رہتا ہوں میں

چاہتے ہیں سب خوشی کا پیرہن　　درد کی پوشاک میں رہتا ہوں میں

مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ سب نقوش　　کس جہانِ خاک میں رہتا ہوں میں

چھوڑ دیتی ہے زمیں کی جب کشش
گردشِ افلاک میں رہتا ہوں میں

شکور الرحمان فقیؔر

سُونے سُونے دِن ہیں، ریگِ صحرائی کا موسم ہے　　پہلوئے جاناں میں بھی اب تو تنہائی کا موسم ہے
دھوپ دِنوں کی نادانی کی اب تک گہری چھاؤں ہے　　کب سے میرے پیچھے پیچھے رُسوائی کا موسم ہے
دیکھیں سوچ کے ویرانے میں کیا کیا پھول کھلاتا ہے　　میرے زخمی لہجے میں جو سچائی کا موسم ہے
اُس نے اپنے دو ہونٹوں میں سات سمندر گھیرے ہیں　　اُس کی سیدھی باتوں میں بھی گہرائی کا موسم ہے
لشکر گھات میں ہو تو لوگو! کچھ نہ کچھ تو کرتے ہیں　　بیٹھے رہنے کا مطلب تو پسپائی کا موسم ہے
آج دُعائے زیرِ لب بھی فوراً ہی مقبول ہوئی
آج فقیؔر ہمارے شہر میں شُنوائی کا موسم ہے

○○○

دِل سے اُترے غُبار کا موسم　　اب تو آئے وہ پیار کا موسم!
ہم بھی دیکھیں! سرودِ سرو وسمن　　آ تو جائے بہار کا موسم
مے کدے میں برنگِ خاموشی　　ہے ترے انتظار کا موسم
یاد کس کی قفس میں لائی ہے　　نکہتِ کوئے یار کا موسم
اُس کے آنے سے آ گیا ہے فقیؔر
شہرِ جاں میں خُمار کا موسم

○○○

شکیل جاذب

جب کبھی دِل کے مضافات میں آ جاتا ہوں
میں خرابے سے خرابات میں آ جاتا ہوں

تو نہ دیکھے تو عجب حبس میں دم گھٹتا ہے
تیرے دیکھے سے میں برسات میں آ جاتا ہوں

جاگتی آنکھ کا اِک خواب سا ہے بیچ کہیں
رات کٹتی ہے تو پھر رات میں آ جاتا ہوں

اپنی منوائے گا تجھ لب سے ادا ہو کے جہاں
جانتا ہے کہ تری بات میں آ جاتا ہوں

میں جو آپے سے ہوا جاتا ہوں باہر جاذبؔ
اُس سے ملتا ہوں تو اوقات میں آ جاتا ہوں

ooo

حاصلِ عمر ہے جو ایک کسک باقی ہے
میری سانسوں میں ابھی تیری مہک باقی ہے

پھر تجھے اور مجھے اور کہیں جانا ہے
ہم سفر ساتھ تو چل جتنی سڑک باقی ہے

مجھ سے کیا چھین سکا تو کہ ابھی تک میرے
پاؤں کے نیچے زمیں سر پہ فلک باقی ہے

اس سے بہتر تھا مجھے راہ نشینی کا یقیں
کیسی منزل ہے پہنچنے پہ بھی شک باقی ہے

یہ کوئی کم تو نہیں دوست جدا ہو کر بھی
اپنے لہجے میں شکایت کی جھلک باقی ہے

تیری ہر شام ستاروں سے سجانا ہے مجھے
جب تک آنکھوں پہ مری اِک بھی پلک باقی ہے

ooo

شکیل سروش

صد آفرین تم پہ مرے دیس کے عوام
دُنیا میں تم نے خود کو مثالی بنا دیا

سچ کا لباس جھوٹ کو پہنا کے کس طرح
کالک کو اپنے چہروں کی لالی بنا دیا

عزت کمائی خوب زمانے میں اس طرح
اپنے وطن کے نام کو گالی بنا دیا

جتنے تھے رسہ گیر ہوئے رہبرِ وطن
چوروں کو اپنے دیس کا والی بنا دیا

دانش وروں نے بیچ دی لفظوں کی آبرو
معیار اپنا چائے کی پیالی بنا دیا

ہم نے اَنا پہ حرف نہ آنے دیا سرؔوش
گردن کٹا کے خود کو مثالی بنا دیا

○○○

شناور اِسحاق

یہ جتنے رنگ ہیں رنگِ حنا سے جا ملیں گے
ہم اپنی اصل سے یعنی خدا سے جا ملیں گے

صحیفوں کی اُبھرتی ڈوبتی سرگوشیوں میں
ترے شوریدہ سَر مرگِ صدا سے جا ملیں گے

کوئی دِن ہیں بکھر جائے گا یہ سحر تماشا
یہ سب چہرے شکستِ آئینہ سے جا ملیں گے

تری آنکھیں بھی عرضِ مُدّعا میں جل بجھیں گی
ہماری ہاتھ بھی شامِ دُعا سے جا ملیں گے

ہمارا اَنت بھی شبدوں کے ساگر میں لکھا ہے
ہم اپنے کاروانِ گمشدہ سے جا ملیں گے

ooo

غزالِ عصر کی دم خوردگی سے ڈرتے ہیں
رگوں میں پھیلتی یخ بستگی سے ڈرتے ہیں

ہمیں خوشی سے عداوت نہ دُکھ سے نفرت ہے
ہم اِس غبار کی آوارگی سے ڈرتے ہیں

بھرم کھلے نہ کھلے ، آئنہ دُھلے نہ دُھلے
مگر یہ سچ ہے کہ ہم زندگی سے ڈرتے ہیں

دیارِ رُوح میں نصف النہار ہے ، سو ہم
بدن میں گونجتی و ماندگی سے ڈرتے ہیں

ترے جمال کی تسبیح کرنے والے لوگ
عجیب لوگ ہیں ، آسودگی سے ڈرتے ہیں

ooo

دھڑکن دھڑکن بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے
جینا ہو تو جان سے جانا پڑتا ہے

شام تو مہلت واپس لینے آتی ہے
شام سے پہلے دِیا جلانا پڑتا ہے

تو کیا جانے منظر کیسے کھلتے ہیں
آنکھ سے پہلے دِل کو جانا پڑتا ہے

اے شہزادی عشق سمجھ یا مجبوری
ہم کو تیرے باغ میں آنا پڑتا ہے

گاؤں کو بھی تو زندہ رکھنا ہوتا ہے
ہم جیسوں کو شہر میں آنا پڑتا ہے

کتنی گھٹیا چیز ہے دُنیاداری بھی
دُشمن سے بھی ہاتھ ملانا پڑتا ہے

بعض اوقات شناورؔ یوں بھی ہوتا ہے
شہر بدر کو واپس لانا پڑتا ہے

شہاب صفدر

مسمار ہوں کہ خود کو اُٹھانے لگا تھا میں　　مٹی سے آسمان بنانے لگا تھا میں
بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے　　تصویر سے غبار ہٹانے لگا تھا میں
آواز دے کے روک لیا اس نے، جس گھڑی　　مایوس ہو کے لوٹ کے جانے لگا تھا میں
ٹھٹھکا ذرا جو دھیان مرے ہاتھ جل گئے　　بوسیدہ کاغذات جلانے لگا تھا میں
افسوس! خوابِ مرگ نے مہلت نہ دی شہابؔ　　سویا ہوا نصیب جگانے لگا تھا میں

OOO

جب میں سچائی کے دفتر آتا ہوں　　آنکھیں باہر رکھ کر اندر آتا ہوں
پھر بھی موسم لیتا ہے پہچان مجھے　　اوڑھ کے کیسے کیسے منظر آتا ہوں
گر یہ ٹوٹا پھوٹا دِل منظور نہیں　　تم بیٹھو میں دُنیا لے کر آتا ہوں
جانے کیسا روگ ہے اکثر شام ڈھلے　　چوٹ لگے دِل کی صورت بھر آتا ہوں
بن جاتے ہیں ہیرے تیری چوکھٹ تک　　گھر سے لے کر ہاتھ میں کنکر آتا ہوں
آتا ہوں میں تاریکی کے شہر مگر　　سورج بن کر نوکِ سناں پر آتا ہوں

لاکھ شہابؔ زمانہ آنکھیں بند کرے
میں ہوں سچ اور خوابوں میں در آتا ہوں

OOO

رُک نہ پائے گی چشمِ تر سے بھی　　موجِ غم بڑھ گئی جو سر سے بھی
چاہتے تھے مَلک کہ چھن جائے　　اختیارِ خطا بشر سے بھی
چل پڑے تو گزر گئے حد سے　　جو نکلتے نہیں تھے گھر سے بھی
کچھ مقرر تھا رزقِ غم اپنا　　مِل گیا کچھ اِدھر اُدھر سے بھی

باغ ، صحرا کا ہم نوا ہے شہابؔ
وہ اگر اَبر ہے تو بر سے بھی

شہزاد نیّر

وہ تن کا تماشائی رہا من ، نہیں دیکھا
دہلیز تک آیا بھی تو آنگن نہیں دیکھا
چہرے پہ کھلی دُھوپ میں اِسی درجہ مگن تھا
آنکھوں سے برستا ہوا ساون نہیں دیکھا
اِس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے اُدھر سے
دُکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا
دروازے پہ آ کر جو کسی نے بھی صدا دی
دِل کھول دیا دوست یا دُشمن نہیں دیکھا
کیوں میری تمنّا کی طرف دیکھ رہے ہو
کیا تم نے کبھی آگ پہ خرمن نہیں دیکھا
اُس نے بھی تبسّم کا ہنر دیکھ کے نیّر!
آلام چھپانے کا مرا فن نہیں دیکھا

○○○

گر جائیں زمیں پر تو سنبھالے نہیں جاتے
بازار میں دُکھ درد اُچھالے نہیں جاتے
جاتے نہیں صحراؤں کو ہم عشق گرفتہ
جب تک دلِ مجنوں کی دُعا لے نہیں جاتے
اب مجھ سے اِن آنکھوں کی حفاظت نہیں ہوتی
اب مجھ سے ترے خواب سنبھالے نہیں جاتے
آنکھوں سے نکلتے ہو مگر دھیان میں رکھنا
تم ایسے کبھی دِل سے نکالے نہیں جاتے
جنگل کے یہ پودے ہیں انھیں چھوڑ دے نیّر!
غم آپ جواں ہوتے ہیں پالے نہیں جاتے

○○○

شہزاد احمد

رات افسردہ ہوئی دیکھ کے حالت میری　　پھر بھی حیرت ہے کہ ہستی ہے سلامت میری
اپنے غم لوگوں میں تقسیم کیے جاتا ہوں　　مجھے کنگال نہ کر دے یہ سخاوت میری
یہ زمانہ تو سمجھ میں نہیں آنے والا　　کسی شب مجھ کو نگل جائے گی حیرت میری
مَیں ہوا خوری کو گلشن میں چلا آیا تھا　　اور صبا لوٹ گئی دیکھ کے صورت میری
میں نے اِک خط کسی بے نام پتے پر بھیجا　　آپ بھی تو نہیں سنتے تھے شکایت میری
مَیں اب اِن خاک کے ذرّوں کو سمیٹوں کیسے　　منظروں کی طرح بکھری ہے محبت میری
اب تو اُٹھنے نہیں دیتی ہے زمینوں سے مجھے　　آسمانوں پہ نہ لے جائے نقاہت میری
مجھ کو معلوم ہے یہ بات بتانے کی نہیں　　آپ محسوس تو کرتے ہیں ضرورت میری
آئے گی چار طرف سے تری آواز کی گونج　　ختم ہو جائے گی جس روز سماعت میری
مَیں نے چاہا تھا کنکھیوں سے تجھے دیکھ سکوں　　آنکھ نے تری ، پکڑ لی ہے شرارت میری

بھیگ جاؤں گا مَیں اپنے ہی لہو میں شہزاؔد
اَبر آئے ہیں تو پھر آئے گی شامت میری

○○○

وہ تو کبھی ہونا ہی نہیں ہے ، جو کچھ ہو سکتا ہے　　مَیں خود بھی حیران ہوا تھا، مَیں نے کیا سوچا ہے
ہم تو پرانے لوگ ہیں، شہروں کی مٹی جیسے ہیں　　اور نیا اِنسان تو شاید غاروں میں رہتا ہے
بس وہ ہے اور اِس کے سوا پہچان نہیں ہے کوئی　　جب مَیں سو جاتا ہوں، دِل میں کوئی جاگ اُٹھتا ہے
تیرے جیسا کچھ موجود نہیں ہے، سارے فلک پر　　اے دھرتی کے رہنے والے! تو کتنا تنہا ہے

اِتنا کیوں گھبرائے ہوئے ہو، اِتنے پریشاں کیوں ہو
لوگو اپنی بند آنکھوں سے ، تم نے کیا دیکھا ہے

○○○

شیخ اعجاز

پھر اِک آشیانہ بنانے لگے ہیں انھی بجلیوں کو بلانے لگے ہیں
یہ کس اِمتحاں کی گھڑی آ گئی ہے گئے دِن ہمیں یاد آنے لگے ہیں
بھروسہ تھا جن کی وفاؤں پہ ہم کو وہ اب ہم سے دامن بچانے لگے ہیں
جو اُونچے ہوئے ہیں ہماری بدولت وہی ہم کو نیچا دِکھانے لگے ہیں
مصیبت میں جن کی دیا ساتھ ہم نے وہی سنگ ہم پر اُٹھانے لگے ہیں
جنھیں دِل میں رکھا بڑی آبرو سے وہ نظروں سے ہم کو گرانے لگے ہیں

سکوں جن سے ملتا تھا اعجازؔ مِل کر
وہی لوگ ہم کو ستانے لگے ہیں

○○○

مولا عنایتوں کا بھرم ا ور چاہیے سوکھی زمیں پہ ابرِ کرم اور چاہیے
اِتنے نہیں ہیں زخم کہ آنسو چھلک پڑیں کہہ دو ستم گروں سے ستم اور چاہیے
بدلیں گے ہم بھی دیکھنا تقدیر کا لکھا تھوڑا سا بس یہ زورِ قلم اور چاہیے
اب تک بھی آ سکے نہیں ہم سیدھی راہ پر نبیوں کا اِس زمیں پہ جنم اور چاہیے
تھوڑے سے اور ہیں ابھی محرومیوں کے زخم اہلِ کرم ذرا سا کرم اور چاہیے
پورے اُتر سکے نہ قسم سر کی کھا کے تم اِس بار کوئی ہم کو قسم اور چاہیے

اعجازؔ جب معاملہ ٹھہرا بتوں کے سَر
پھر تو صنم کے بعد صنم اور چاہیے

○○○

صابر ظفر

نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے تو کیا رہے گا　　ہماری ہجرت سے اِک مسلسل خلا رہے گا
بجھا رہے گا ہر ایک دِل ، رنگ اُڑا رہے گا　　نجانے کب تک یہاں سماں حزنیہ رہے گا
ہر ایک لختِ جگر کا سینہ جو ہو گا چھلنی　　تو دودھ ماؤں کا کس طرح دودھیا رہے گا
جہاں ترے حُسن کی مسلسل پڑیں گی پھواریں　　وہاں گُلِ یاسمیں مسلسل کھلا رہے گا
دوبارہ کہتا ہوں پہلے بھی مَیں یہ کہہ چکا ہوں
جہاں بھی محراب ہے وہاں اژدہا رہے گا

OOO

نہ بھولے کسی طور منظر کئی　　گئے چھوڑ کر نقش دِل پر کئی
نظارے تو تھے رُوح پرور کئی　　نظر کے بھی لیکن تھے محور کئی
یہ سوچا تھا رُک جائیں گے ہم کہیں　　مگر غم کے کُھلتے گئے دَر کئی
کہاں پار لگتے کہاں ڈوبتے　　کنارے کئی تھے سمندر کئی
کبھی اِس جہنم سے باہر نکل
ملیں گے تجھے لوگ بہتر کئی

OOO

دربدر پھرتا ہوں اور خاک بسر رہتا ہوں　　وہ جدھر مِل نہیں سکتا مَیں اُدھر رہتا ہوں
جس کنارے کی طرف گرمِ سفر رہتا ہوں　　مِل بھی جائے تو ذرا فاصلے پر رہتا ہوں
کوئی آ جائے اِدھر ساتھ نہانے والا　　عشق وہ جل ہے جہاں شام وسحر رہتا ہوں
مجھے بھاتا ہی نہیں اور ٹھکانہ کوئی　　جہاں تکتا ہوں وہ صورت، وہیں مَر رہتا ہوں
کیا خبر کون مسافر سرِ منزل لے جائے
خاک ہوں اور سرِ راہ گزر رہتا ہوں

OOO

اُڑا کرتے تھے جو اپنی ہَوا میں　　　سمٹ کر رہ گئے ہیں نقشِ پا میں
خدا جانے ہیں گم کس اِبتلا میں　　　کشش پاتے نہیں جو دِلرُبا میں
نہیں جن کو کسی منظر سے رغبت　　　وہ غارت کر رہے ہیں اپنی شامیں
سنو اِن دھڑکنوں کو آخرِ شب　　　نویدِ صبح ہے دِل کی صدا میں
ظفؔر ، ٹھہرا ہوا پانی ہو جیسے
سکوت ایسا ہے آہِ نارسا میں

○○○

نکل کے دائرۂ عشق سے کدھر جائیں　　　پکارتا ہے قلم ، حاشیے کدھر جائیں
مَیں سوچتا ہی نہیں راستے کدھر جائیں　　　مَیں دیکھتا ہی نہیں دوسرے کدھر جائیں
جوسورہے ہیں کدھر جائیں اپنے سپنوں میں　　　جو سو نہیں رہے وہ جاگتے کدھر جائیں
کوئی کنارہ نہیں اور کوئی سہارا نہیں　　　سو تیریں کب تلک اور تیرتے کدھر جائیں
وہ ہر جگہ ہے تو کیوں ہر جگہ نہیں ملتا
وہ ہرطرف ہےتو پھرڈھونڈنے کدھرجائیں

○○○

صابر ملک

جنون ہے کہ روایت کی پاسداری ہے — خزاں نے دشت میں اپنی قبا اُتاری ہے
کٹا ہوا ہے تمدن سے اِن دِنوں وہ شخص — کہ بل ہی چہرے پہ اُس کے نہ اِنکساری ہے
تمہاری چشمِ محبت سے آنکھیں ٹھنڈی ہیں — تمہارے رہن ، دِل و جاں کی تاجداری ہے
ذرا سا دَم بھی اگر لوں تو دَم نکل جائے — بڑے ہی کرب میں تیری تلاش جاری ہے
ہمارے منہ سے ترا نام یوں بھی جچتا ہے — کہ اپنے حصے کی ہر سانس تجھ پہ واری ہے
فریب خوردہ محبت ! تمہارے صدقے میں — ابھی تک آنکھ کے چشموں سے فیض جاری ہے

ہر ایرے غیرے کا اِس سے گزر نہیں صابؔر
حریمِ دِل میں فقط ایک راہداری ہے

ooo

رتجگوں کا مَلال تھے ہم لوگ — کتنے روشن خیال تھے ہم لوگ
ہم سے بہتر کوئی مثال نہ تھی — آپ اپنی مثال تھے ہم لوگ
ایک ٹوٹی ہوئی صدا کی گونج — ایک چبھتا سوال تھے ہم لوگ
کیا نہیں تھے کہ اور کچھ ہوتے — یعنی مطلق وصال تھے ہم لوگ
قلبِ اسود غلافِ کعبہ میں — کس کے زیرِ جمال تھے ہم لوگ
دِل کی ہر بات دِل سے محو ہوئی — کس قدر ہم خیال تھے ہم لوگ

تھا تو صابؔر بھی بر برابر کا
اُس کے شر سے نڈھال تھے ہم لوگ

ooo

صبیحہ صبا

یہ دُھوپ چھاؤں کا منظر ہمیں دِکھاتی ہے ہنسا ہنسا کے کبھی زندگی رُلاتی ہے
ترا وجود بھی اُمید کی کرن جیسے نئی صدی نئے اِمکان لے کے آتی ہے
تم اور مُلک کے باسی ہم اور دیس کے لوگ کہاں کہاں سے کہاں زندگی مِلاتی ہے
بہت ہی دُکھ ہے وہاں پر جہاں جدائی ہے یہ ایسی راہ گزر ہے جو دِل دُکھاتی ہے
عجیب چپ سی لگی ہے کہیں تو دُوری میں دِلوں میں درد کے خیمے کہیں لگاتی ہے
محبتوں کے سفر میں کسی کی یاد صباؔ
اندھیری شب میں بہت روشنی جلاتی ہے

ooo

جب کبھی حادثات نے مارا یوں لگا کائنات نے مارا
وہ جو منصور کی ادا ٹھہری اس کو اظہارِ ذات نے مارا
لوگ دُنیا کا غم اُٹھاتے ہیں ہم کو چھوٹی سی بات نے مارا
ہم نہ منہ پھیر کر گزر پائے چند لمحوں کے ساتھ نے مارا
دِن تو کٹ ہی گیا تھا اُن کا مگر کم نصیبوں کو رات نے مارا
موت کا دم صباؔ غنیمت ہے
ورنہ پل پل حیات نے مارا

ooo

صفدر صدیق رضیؔ

آنکھوں میں ہے اب تک وہی زیبائشِ دُنیا — رکھا نہ کہیں کا مجھے اے خواہشِ دُنیا!
اچھا ہے کہ جلتے ہو خود اپنی ہی تپش میں — تم تک ابھی پہنچی ہی نہیں آتشِ دُنیا
چشم ولب و عارض میں ہیں اندیشۂ صد رنگ — جس دم وہ کھلا مجھ پہ کھلی سازشِ دُنیا
وسعت میں ہمیشہ سے جداگانہ ہیں دونوں — دُنیا میں نہیں دِل میں ہے گنجائشِ دُنیا
اے جذبۂ پندار قدم بوس نہ ہونا — پاؤں سے لپٹ جائے گی آلائشِ دُنیا
گھر چھوڑ کے نکلے جو کبھی دربدری کا — واں گردشِ ایام تھی یاں گردشِ دُنیا
دُنیا کو کیا ترک جب اُس کے لیے ہم نے — تب اُس نے رضیؔ ہم سے کی فرمائشِ دُنیا

ooo

حدِّ موج و ساحل پر ناگہاں جلا ڈالیں — ہم نے عشق ہوتے ہی کشتیاں جلا ڈالیں
حسن میں وہ آتش تھی حسن تھا وہ آتش میں — بے اِرادہ ہم نے بھی اُنگلیاں جلا ڈالیں
چند خوش جمالوں کے منتشر خیالوں میں — ہم نے اَن گنت شمعیں رائیگاں جلا ڈالیں
خواب اپنی آنکھوں کے کس کی نذر کر ڈالے — مشعلیں کہاں کی تھیں اور کہاں جلا ڈالیں
جن رفاقتوں میں ہم جلتے بجھتے رہتے تھے — سیلِ آب و آتش کے درمیاں جلا ڈالیں
سایہ دار پیڑوں کو کھا گئی تپش آخر — شہر کے الاؤ نے بستیاں جلا ڈالیں

ooo

ہم نے کی دستِ حنائی پہ جو بیعت اس کی — ہم سے کس کس نے سمیٹی ہے محبت اس کی
پرچمِ اَبر کھلا چاکِ گریباں کی طرح — آج بھی قریۂ جاں پر ہے حکومت اس کی
یہ اسے کہہ دو کہ وہ اب تو مسلماں ہو جائے — کوئی کافر کیے جاتا ہے عبادت اُس کی
کہیں رستے میں وہ مِل جائے ، مقدر میرا — کسی منزل پہ میں مِل جاؤں یہ قسمت اُس کی
وہ ہمارا جو نہیں ہے تو کسی کا بھی نہ ہو — اِک رقابت پہ ہے موقوف محبت اس کی
مجھ سے پل بھر کو بھی وہ شخص بھلایا نہ گیا — آ گئی ہے مرے بچوں میں شباہت اُس کی

صفی حسن

ہر سانس ہے تلوار خدا حافظ و ناصر
اے دردِ غمِ یار خدا حافظ و ناصر

تکیہ کیے ہو جس پہ وہی خستہ تنوں آج
گرنے کو ہے دیوار خدا حافظ و ناصر

کچھ بھی شبِ ہجراں میں دِکھائی نہیں دیتا
اے دیدۂ خوں بار خدا حافظ و ناصر

اَب میرے مسیحا کی نظر اور طرف ہے
بس اے دلِ بیمار خدا حافظ و ناصر

جو تو نے دیا اُس کا میں ممنونِ نظر ہوں
اے چہرۂ گلنار خدا حافظ و ناصر

روئے نہ کوئی مجھ پہ شبِ غم میں کہ میں ہوں
خود اپنا عزادار خدا حافظ و ناصر

اب حشر کے اِک وعدۂ فردا پہ جیوں گا
لے اَے مرے دِلدار خدا حافظ و ناصر

رونے کے بہانے ہیں صفؔی اور نہیں کچھ
کیا میں ، مرے اشعار خدا حافظ و ناصر

ooo

حدیثِ دِل کی روایت نہیں جو ختم ہوئی
میں حرفِ حق ہوں عبارت نہیں جو ختم ہوئی

چراغ لے کے مجھے ڈھونڈتے ہیں اہلِ نظر
کہ میرا ملنا ضرورت نہیں جو ختم ہوئی

کہ اُس کا چہرہ ہمیشہ نظر میں رہتا ہے
یہ دو گھڑی کی عبادت نہیں جو ختم ہوئی

جبینِ وقت پہ روشن ہوں میں سحر کی طرح
کہ میری قدر ہے قیمت نہیں جو ختم ہوئی

میں منزلوں سے گزر کر بھی منزلوں میں ہوں
کہ راستہ ہوں مسافت نہیں جو ختم ہوئی

مرا یقیں مری آنکھوں میں سانس لیتا ہے
کسی نگاہ کی حیرت نہیں جو ختم ہوئی

میں اِک چراغ ہوں روشن کئی چراغوں میں
مرا وجود وہ ساعت نہیں جو ختم ہوئی

کہ میرا اُس کا محبت کا ایک رِشتہ ہے
یہ رنگ و بُو کی شباہت نہیں جو ختم ہوئی

خود اپنے ضبطِ محبت سے چپ لگی ہے صفؔی
کسی کی دی ہوئی مہلت نہیں جو ختم ہوئی

ooo

تارِ ملبوس شہی آئے تو سب دیکھتے ہیں
اور کوئی چاک گریباں ہو تو کب دیکھتے ہیں

ایسے بھی خستہ نظر لوگ مرے شہر میں ہیں
جب سحر جاگنے لگتی ہے تو شب دیکھتے ہیں

بند آنکھوں سے چلے جاتے ہیں منزل کی طرف
کوئی ٹھوکر لگے جب پاؤں میں تب دیکھتے ہیں

چھیڑ کر ہم یونہی گفتار کے آئینے میں
تری صورت تری شیرینیِ لب دیکھتے ہیں

شخصیت جانچنی پڑ جائے تو پھر اہلِ نظر
آبِ گوہر کی طرح نام و نسب دیکھتے ہیں

کوئی بھی زخم ہمارے نہیں بھرنے والا
تری جانب ہی نظر اُٹھتی ہے جب دیکھتے ہیں

بچ سکا کون صفؔی وقت کی سنگینی سے
کل جسے دیکھ نہ پائے تھے سو اَب دیکھتے ہیں

ooo

رُکا ہوا سا لبوں پر سوال جو بھی تھا
کہ میں نے کہہ دیا سب دِل کا حال جو بھی تھا

وہ سر جھکا کے مِلا تھا سو اُس پہ میں نے بھی
بھلا دیا کبھی دِل میں ملال جو بھی تھا

شبانِ ہجر میں روشن کیا مجھے اُس نے
وہ اِک خیال ، سحر کی مثال جو بھی تھا

بڑے گمان سے پھینکا گیا تھا لوگوں پر
کہ اُس کے ہاتھوں میں خوابوں کا جال جو بھی تھا

جب اپنے دَرد سب اُس کے سپرد کر ہی دِیئے
تو خود سلجھ گیا کارِ محال جو بھی تھا

کہاں تلک میں تیری بخششیں شمار کروں
ترا کمال تھا مجھ میں کمال جو بھی تھا

میں کیوں صفؔی اُسے غیروں کی آنکھ سے دیکھوں
وہ جانِ جاں تھا مرا خوش خصال جو بھی تھا

ooo

اپنوں کی خلش ہے کہ کسی ذات کا دُکھ ہے
اے چشمِ گریزاں تجھے کس بات کا دُکھ ہے

اِک رنجِ مسلسل ہمیں وِرثے میں مِلا ہے
اندوہِ سحر ہے تو کبھی رات کا دُکھ ہے

کیسے کہوں پھر سے اُسی دروازے پہ جائے
وہ جس کو ابھی پہلی ملاقات کا دُکھ ہے

امروز بھی گھائل مرا فردا بھی ہے بے کیف
سچ پوچھیں تو بے مہریِ حالات کا دُکھ ہے

پوچھے تو کوئی مجھ سے مرے گریہ جاں کا
جو مر گئیں اُن زندہ روایات کا دُکھ ہے

پہلے تو گلہ آنکھوں سے تھا خشک روی کا
اَب اِن میں چھلکتی ہوئی برسات کا دُکھ ہے

صلاح الدین ناصر

چاند پر جب کبھی بھرپور جمال آتا ہے
دِل میں رہ رہ کے ترے رُخ کا خیال آتا ہے
تیرے جلووں کا اثر ہے کہ مری تشنہ لبی
تیری محفل سے مرا دِل جو نڈھال آتا ہے
مجھ کو کر دیتا ہے شرمندہ مرا پاسِ وفا
تیری بے مہری کا جب لب پہ سوال آتا ہے
کچھ نہ کچھ کھوَلتا رہتا ہے مرے سینے میں
ورنہ اَشکوں میں کہاں اِتنا اُبال آتا ہے
کاش تو نے بھی کبھی غور سے دیکھا ہوتا
چاند، سورج کا فلک پر بھی زوال آتا ہے
کیوں مرے عشق پہ ہنستا ہے زمانہ، ناصؔر
یہ وہ جذبہ ہے جسے کسبِ کمال آتا ہے

ooo

جو درد تھا وہ دامنِ مژگاں میں آ گیا
تو گل میں، گلستاں میں، بہاراں میں آ گیا
روشن ترے خیال سے دیوار و در ہوئے
گھر میرا ظلمتوں سے شبستاں میں آ گیا
بے چین دِل کو میرے مِلا اس طرح قرار
ساحل مرے قریب ہی طوفاں میں آ گیا
میں تجھ کو بھول جاؤں یہ ممکن نہیں مگر
بے چارا ذہن گردشِ دوراں میں آ گیا
بیدار ہو گئی ہے ملاقات کی اُمید
کتنا سکون پھر سے دِل و جاں میں آ گیا!
ناصؔر، وفا نے ہجر کے سب زخم بھر دیئے
مرہم وفا میں، صبر نمکداں میں آ گیا

ooo

ضیاء پرویز

رہینِ اہلِ زر نہ پوچھ
حسنِ فتنہ گر نہ پوچھ
مجھ سے دِل کی حالتیں
میرے چارہ گر نہ پوچھ
کسی کو کچھ خبر نہیں
حرفِ خیر و شر نہ پوچھ
تو بتا کہ ہے کہاں
مجھ سے میرا گھر نہ پوچھ
کشمکشِ عشق میں
روئے عمر بھر نہ پوچھ
مجھ سے میرے ہمسفر
آج رہ گزر نہ پوچھ
کس طرف ضیاء گیا
دربدر سے در نہ پوچھ

ooo

کس قدر ہے اثر تمازت کا
دے جو سایہ شجر تمازت کا
دِل کے جوگی نے کر لیا یارو
پا برہنہ سفر تمازت کا
صرف جُھلسا رہی ہے سوچوں کو
یہ بھی دیکھا ہنر تمازت کا
غم کے سورج کا یہ کرشمہ ہے
کھول رکھتا ہے دَر تمازت کا
اب تو بارش میں بھی ضیاؔء صاحب
لمحہ لمحہ ہے ڈر تمازت کا

ooo

یہ پیاس بھی ہوسکتی ہے مضراب کی صورت
معدوم ہے اطوار میں آداب کی صورت
رہتا ہے مری آنکھ میں انوار کا عالم
یوں آنکھ میں اُترا ہے وہ مہتاب کی صورت
لگتا ہے کہ جینے کی سزا کاٹ رہا ہے
ہر شخص یہاں ماہی بے آب کی صورت
تم خاک بتاؤ گے حسیں کہتے ہیں کس کو
دیکھی ہی نہیں تم نے گلِ تاب کی صورت
کس شخص نے اُس شکل پہ آسیب کیا ہے
تم سی تو نہیں ہے یہ ترے خواب کی صورت
اب دیکھ ضیاء سے یہ کنارا ہی بھلا ہے
وہ دِل بھی تو ہے غم کے ہی تالاب کی صورت

ضیاء حسین ضیاء

زرد گلاب ، جنوں مضرابی زخموں کو تقسیم کیا
وقت نے کیسے تان اُڑاتے لہجے کو تقسیم کیا
آدھی رات گمانوں کی بستر پر پہرے دار رہی
آدھی رات نے خود کو میرے تکیے پر تقسیم کیا
پہلے میں نے یادوں کے مرقد پر گل افشانی کی
اور پھر خود کو اس کے نام کے گجرے پر تقسیم کیا
پہلا روز اَزل کش تھا جب یزداں کی آواز سنی
اور پھر وقت کو میں نے اپنے لمحے پر تقسیم کیا
جب پانی کو مٹی سی آنکھوں نے سوچنا بند کیا
تب صحرا کو میں نے تن کے خیمے پر تقسیم کیا
پہلے میں نے قاتل کی تصویر اُتاری آنکھوں میں
اور پھر آدھی رات کو میں نے گھوڑے پر تقسیم کیا

ooo

اَشک آنکھوں سے بے اثر گئے ہیں
ہم ترے شہر سے گزر گئے ہیں
ہم صنم خانۂ خیال میں تھے
اپنے ہاتھوں سے خود سنور گئے ہیں
چاند پیتے ہوئے صنوبر یار
آن کی آن میں کدھر گئے ہیں
ہم خدائی کے ہو گئے دَر پے
یعنی ہم چاک سے اُتر گئے ہیں
اِک خرابۂ دِل بناتے ہوئے
تھوڑا بگڑے ، بہت سنور گئے ہیں
بدظنی ، رَیب اور تھوڑا خدا
دِل کے کوچے میں سب اُتر گئے ہیں
تجھ پہ بس اعتبار کرتے ہوئے
بے یقینی کے بت بکھر گئے ہیں

ooo

اُنگلیوں کی پوروں پر شب کا رقص جاری ہے
'میں' کا چاک بر ہم ہے 'سب' کا رقص جاری ہے
ہم کہیں سنبھلنے میں بے جمال ہو نکلے
ورنہ اس خدائی میں چھب کا رقص جاری ہے
میں اَزل میں یزداں کے جب سے پاؤں چھو بیٹھا
'کُن' کی اوٹ میں یارو تب کا رقص جاری ہے

آپ اپنے پاؤں پر کوئی تو لکھیں تاریخ — آپ کو خبر تو ہو کب کا رقص جاری ہے
کیسا سبز جادو ہے زخم مسکراتا ہے — تاب کی ہتھیلی پر 'تب' کا رقص جاری ہے
کون میرے پہلو میں گفتگو پہن آیا — اِک زمانہ ہو گزرا لب کا رقص جاری ہے
یار تیرے چہرے پر چشمِ بے کشادہ کیوں؟ — ورنہ دیکھ لیتا تو ربّ کا رقص جاری ہے

ooo

مجھ کو میری خبر سنا ہی نہیں — چاک پر میں ابھی بنا ہی نہیں
راستہ مجھ پہ یوں نثار کہ میں — کسی اُمید پر چلا ہی نہیں
کس خدائی میں پھنس گئے ہو تم — میرے دِل ، یہ مری دُعا ہی نہیں
کبھی یزداں بھی ہاتھ آتا مرے — یہ تماشا مجھے مِلا ہی نہیں
اے مری بہتری کے خواہش مند! — زخم کا دوسرا سرا ہی نہیں
یہ مری زندگی جو رقص میں ہے — یہ مرے بخت کی عطا ہی نہیں
میں تری نذر کرنا چاہتا تھا — پھول جو ہاتھ پر کھلا ہی نہیں
میں کسی اور کے سخن میں تھا — میں نے اپنا سخن کہا ہی نہیں

ooo

مکاں رہے ہیں مگر ہم مکیں نہیں رہے ہیں — کہ اب تو بسترِ جاں کے قریں نہیں رہے ہیں
لپیٹ رکھے ہیں رُخ پر تو اَب خس و خاشاک — اے آئینہ صفت اَب ہم حسیں نہیں رہے ہیں
اے گرمیٔ رُخِ اَندیشہ کھینچ اپنا خمار — کہ ہم کماں نہ رہے ہیں، کمیں نہیں رہے ہیں
ہمیں ہے اپنے ہی ان آبلوں سے پسپائی — ترے اے خاتمِ صحرا نگیں نہیں رہے ہیں
ہمیں اُٹھائے پھرے ہے ہوا یوں رنج بکف — کہ جیسے اَب تو رہینِ زمیں نہیں رہے ہیں
ہمیں لپیٹ دیا زندگی نے بستر سے — کہ جیسے خوابِ نظر خواب گیں نہیں رہے ہیں
میں اَب بھی جاتا ہوں ساحل کی دُھند سے ملنے — سحاب دِل کے مگر نیلمیں نہیں رہے ہیں
اُبھر رہے ہیں مری آنکھ سے مرے نقّشے — یہ دِل گداختہ اب تہہ نشیں نہیں رہے ہیں

ضیا پڑھو کہ کتابِ فنا یہ کہتی ہے
نہ شاہ وار رہے ہیں نہ شہ نشیں رہے ہیں

ooo

طارق نعیم

پوشیدہ کسی ذات میں پہلے بھی کہیں تھا
میں اَرض و سماوات میں پہلے بھی کہیں تھا

اِک لمحۂ غفلت نے مجھے زیر کیا ہے
دُشمن تو مری گھات میں پہلے بھی کہیں تھا

بے وجہ نہ بدلے تھے مصوّر نے اِرادے
میں اُس کے خیالات میں پہلے بھی کہیں تھا

اس کے یہ خدوخال زمانوں میں بنے ہیں
یہ شہر مضافات میں پہلے بھی کہیں تھا

اِک حرف جو اَب جا کے ثمر بار ہوا ہے
وہ میری مناجات میں پہلے بھی کہیں تھا

ooo

تجھ کو اس طرح کہاں چھوڑ کے جانا تھا ہمیں
وہ تو اِک عہدِ وفا تھا جو نبھانا تھا ہمیں

تم تو اس پار کھڑے تھے تمہیں معلوم کہاں
کیسے دریا کے بھنور کاٹ کے آنا تھا ہمیں

ان کو لے آیا تھا منزل پہ زمانہ لیکن
ہم چلے ہی تھے کہ درپیش زمانہ تھا ہمیں

وہ جو اِک بار اُٹھا لائے تھے ہم عُجلت میں
پھر وہی بار ہر اِک بار اُٹھانا تھا ہمیں

وہ تو ایسا ہے کہ مہلت نہ ملی تھی ورنہ
اپنی بربادی پہ خود جشن منانا تھا ہمیں

یہ بھی کیا کم ہے کہ رُخصت ہوئے اعزاز کے ساتھ
اور اس کام پہ کیا نام کمانا تھا ہمیں

ooo

مری تہذیب میرے خواب رُخصت ہو رہے ہیں
محبت کے سبھی آداب رُخصت ہو رہے ہیں

حسابِ قبر بھی ہو جائے گا کچھ دیر ٹھہرو
ابھی دیکھو مرے احباب رُخصت ہو رہے ہیں

جہانوں کے زمانوں کے اَمیں ہوتے ہوئے بھی
زمانے دیکھ ہم بے آب رُخصت ہو رہے ہیں

جنھیں ساحل پہ پیاں باندھنے تھے زندگی کے
وہی مجھ سے سرِ گرداب رُخصت ہو رہے ہیں

ترے خورشید کی آمد کے ہیں آثار شاید
کہ میرے انجم و مہتاب رُخصت ہو رہے ہیں

بہت ہی لَو لگا بیٹھے تھے جو دُنیا سے طارقؔ
مثالِ ماہئ بے آب رُخصت ہو رہے ہیں

طارق ہاشمی

پھر کسی قریۂ ہجرت سے مجھے دیکھتا ہے
عشق اب کون سی غایت سے مجھے دیکھتا ہے

کوئی پیغامِ مسلسل ہے مری خاک کے نام
اِک ستارہ بڑی مُدّت سے مجھے دیکھتا ہے

کس کو سمجھاؤں شبِ تار میں دِل کی مشکل
چاند بھی اپنی سہولت سے مجھے دیکھتا ہے

عین ممکن ہے سمندر کو بُلا لوں میں بھی
شہر کا شہر رعونت سے مجھے دیکھتا ہے

ایسی وحشت ہے اِن آنکھوں میں کہ اب صحرا کا
جو بھی ذرّہ ہے عقیدت سے مجھے دیکھتا ہے

کیسا آئینہ ہوں ، حیران نہیں ہوں طارقؔ
دیکھنے والا بھی حیرت سے مجھے دیکھتا ہے

ooo

درد کرتا ہے سفر آنکھ کے اندر کی طرف
اَشک گرتے ہیں مگر آنکھ کے اندر کی طرف

جس سے کچھ لوگ گزرتے ہیں سرِ قریۂ جاں
کہیں کُھلتا ہے وہ در آنکھ کے اندر کی طرف

دِل کے پاتال میں سو درد نظر آئیں گے
جھانک کچھ اور مگر آنکھ کے اندر کی طرف

تو نے مژگاں پہ جہاں نام لکھا دیکھا تھا
اسی کوچے میں ہے گھر آنکھ کے اندر کی طرف

میرے دِل سے وہ کبھی جا نہیں سکتا باہر
کوئی آ جائے اگر آنکھ کے اندر کی طرف

جا نکلتی ہے کسی اور جہاں میں طارقؔ
دِل کی اِک راہ گزر آنکھ کے اندر کی طرف

ooo

غم کی گہرائیوں میں پھر سے سمٹ جاتا ہوں
اُس کو لہروں کی طرح چُھو کے پلٹ جاتا ہوں

جب بھی میں سوچتا ہوں اپنی اکائی کے لیے
منتشر ہو کے کئی خانوں میں بٹ جاتا ہوں

راہ میں پڑتے ہیں یہ کیسے طلسمی دریا
پار اُترتے ہوئے میں گرد سے اَٹ جاتا ہوں

جب بھی کرتا ہے کوئی تنگیٔ جادہ کا گلہ
صورتِ شاخِ شجر ، راہ سے کٹ جاتا ہوں

زندگی کرتا ہوں مہ تاب کی صورت طارقؔ
پھر سے بڑھنے کے لیے آپ ہی گھٹ جاتا ہوں

طالب حسین کوثری

دُھول میں جب پھول سے چہرے ملا دیتی ہے موت
مسکراتی زندگی کو بھی رُلا دیتی ہے موت

اِک طرف تو زندگی کو بخشتی ہے سسکیاں
اِک طرف پھولوں سے مرقد کو سجا دیتی ہے موت

جو بنا کرتے ہیں دُنیا میں تکبّر کی چٹان
توڑ کر گردن کو مٹی میں مِلا دیتی ہے موت

دیکھ لے اس کو اگر چشمِ تصوّر سے کوئی
پھر یقیناً خوابِ غفلت سے جگا دیتی ہے موت

موت کرتی ہے اگر اِک زندگی کا اختتام
اِک حیاتِ نو کو حرفِ اِبتدا دیتی ہے موت

بعض انسانوں کے جینے کی ادائیں دیکھ کر
کوثرؔی کچھ اور جینے کی دُعا دیتی ہے موت

ooo

مری زبان پہ آہیں سفر میں رہتی ہیں
بڑی شریر سی نظریں سفر میں رہتی ہیں

خوش آمدید سجاتے ہیں اَشک پلکوں پر
بچھی ہوئی مری آنکھیں سفر میں رہتی ہیں

جبینِ صبح پر لکھا ہے تیرے گھر کا پتا
تری تلاش میں شامیں سفر میں رہتی ہیں

اے ہم سفر ہے ضروری کہ ساتھ ساتھ چلیں
کئی طرح کی بلائیں سفر میں رہتی ہیں

بس ایک جہدِ مسلسل ہے زندگی کا ثبوت
اسی لیے تو ہوائیں سفر میں رہتی ہیں

یہ سانس سانس کا آنا بھی بے سبب تو نہیں
ہے اصل بات کہ رُوحیں سفر میں رہتی ہیں

مری حیاتِ صداقت میں نیند ہے ہی نہیں
میں سو بھی جاؤں تو سانسیں سفر میں رہتی ہیں

وہ کوثرؔی کو کسی رہ گزر پہ مِل جائیں
مری کُھلی ہوئی بانہیں سفر میں رہتی ہیں

ooo

طاہرہ صفی

بہاروں کو خزاں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے
یقیں کو بھی گماں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

اگر اُس کی عنایت ہو جو ہو اُس کا کرم شامل
تو ذرّے کو جہاں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

ہوائیں رُخ بدل لیں تو بچیں گے آشیانے بھی
کہ منظر کو دُھواں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

جہاں نیت بدل جائے گواہی بھی بدل جائے
زباں سے بے زباں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

جنھوں نے لال کھوئے ہیں وہی مائیں بتائیں گی
کہ بچوں کو جواں ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے

ooo

گزر گئی شبِ ہجراں اگر تو کیا ہو گا
جو کھل گیا یہ فریبِ نظر تو کیا ہو گا

درِ قفس تو کھلا ہے مگر یہ ڈر ہے مجھے
بکھر گئے کہیں سب بال و پر تو یا ہو گا

وہ قتل کرتا ہے اور یہ تو سوچتا ہی نہیں
نکل کے آ گئے سب نوحہ گر تو کیا ہو گا

یہی تو سوچ کے رختِ سفر ہی کھول دیا
ہوا نہ گر وہ مرا ہم سفر تو کیا ہو گا

صنم تراشا ہے مَیں نے جو اندھی آنکھوں سے
پلٹ کے آ گئی میری نظر تو کیا ہو گا

حصار کھینچ رہا ہے وہ اپنے چاروں طرف
اگر وہ گھر گیا اپنے ہی گھر تو کیا ہو گا

وہ عکس دیکھ کے آئینہ توڑ دیتا ہے
نظر میں رُک گئی تصویر گر تو کیا ہو گا

ooo

مَیں زنداں کے اندھیروں سے نکلنا چاہتی ہوں
جہاں تک روشنی جائے میں چلنا چاہتی ہوں

اُتر جاؤں گی میں سرسبز گہری وادیوں میں
میں چشمہ ہوں کہ دریاؤں میں ڈھلنا چاہتی ہوں

ہوا کے ساتھ رہ کر پھیل جاؤں گی فضا میں
میں اپنے ساتھ خوشبو لے کے چلنا چاہتی ہوں

جلا کے شمع مانگا تھا کسی نے مجھ کو اُس سے
دِکھا کے روشنی مَیں بھی پگھلنا چاہتی ہوں

نئی سوچوں کے دھاگوں میں پرو کر آگہی کو

ظفر اقبال

گھر میں ہوگا کوئی زخموں کے سوا اور چراغ
شام گہری ہوئی جاتی ہے ، جلا اور چراغ

ہم ہی دونوں کا گزارہ وہاں کیونکر نہ ہوا
جہاں رہتے رہے مِل جل کے ہوا اور چراغ

رات بھر باغ میں ہلچل تھی کوئی چاروں طرف
جلتے بجھتے ہی رہے پھول ، صبا اور ، چراغ

لہر پر ایک چراغ ، اور پھر اس لہر کے بعد
ایک لہر اور تھی ، اس لہر پہ تھا اور چراغ

ایک ہی رُخ پہ لرزتے رہے دونوں ، لیکن
جب رُکی موجِ ہوا ، کانپ گیا اور چراغ

ایک آواز کی آہٹ سی پھر آئی یک دم
اور دیوارِ تماشا سے گرا اور چراغ

پھر بھی چھایا رہا کیوں اِتنا اندھیرا ہر سمت
دونوں روشن تھے یہاں، میری صدا، اور، چراغ

یوں تو نادار بہت ہوں ، مگر اِتنا بھی نہیں
ہیں ابھی تک مری ہاتھوں میں دُعا، اور چراغ

جل رہا ہے مرا دِل بھی ، مری آنکھیں بھی ظفؔر
اس چکا چوند میں اب چاہیے کیا اور چراغ

ooo

کسی طرح کا کوئی اہتمام بھی نہیں تھا
مقابلے میں ہمارا تو نام بھی نہیں تھا

ہم آ گئے تھے شمار و قطار میں کیونکر
کہ آپ سے تو سلام و پیام بھی نہیں تھا

ہم اس کے گھر کا پتا پوچھنا بھی چاہتے تھے
اور اس کے ساتھ ہمیں کوئی کام بھی نہیں تھا

بھٹکتا پھرتا رہا درمیاں میں ہی کہیں عشق
نہ تھا شروع کہیں اختتام بھی نہیں تھا

خیالِ وضع ہمیں خود ہی چاہیے تھا وہاں
کہ عرضِ حال ہمارا مقام بھی نہیں تھا

بہت ہی دُور رہا آس پاس ہوتے ہوئے
وہ حسن زار جو ہم پر حرام بھی نہیں تھا

ہمیں یہ عزتِ رُسوائی کیوں ملی ہے یہاں
کہ شہر میں تو ہمارا قیام بھی نہیں تھا

کہاں سے آئے تھے دریا وہ راہ میں اِتنے
کہ فاصلہ تو وہاں ایک گام بھی نہیں تھا

مہک رہا تھا کوئی شام شام چہرہ ، ظفؔر
کچھ اس طرح سے کہ دیدارِ عام بھی نہیں تھا

ہنسی ہنسی میں جو اُس رات وہ جُدا ہوا ہے
اُسی مقام پہ خوابِ ہوس رُکا ہوا ہے

وہ بات ہم نے بتائی نہیں کسی کو ابھی
وہ بوسہ ہم نے چھپا کر کہیں رکھا ہوا ہے

درخت کٹ گئے ، روشیں بھی ہو گئیں برباد
وہ باغ ایک طرف سے ابھی بچا ہوا ہے

دراصل اِس کو تعلق بھی کہہ نہیں سکتے
کسی کے ساتھ جو اِک تار سا بندھا ہوا ہے

مرے وجود کا جھونکا سا اُس گلستاں میں
کہیں سے آیا ہوا ہے ، کہیں گیا ہوا ہے

یہ میں ہوں تا کہ تم آرام کر سکو دم بھر
جو فرش پر ہی بچھونا سا اِک بچھا ہوا ہے

انھی دِنوں میں اِرادہ سا تجھ سے ملنے کا
یہیں کہیں مرے سامان میں پڑا ہوا ہے

نمی بہم ہوئی اس سرزمیں کو آخرِکار
یہ سبزہ اب کے بہت دیر میں ہرا ہوا ہے

مَیں اِک خمارِ خموشی میں بھی رہا ہوں ، ظفؔر
مرے وجود سے اِک حشر بھی بپا ہوا ہے

ooo

کل جانے کیا ہو ، آج یہ دُنیا تو دیکھ لوں
جی بھر کے رنگِ خوابِ تماشا تو دیکھ لوں

مہلت نہیں زیادہ ، سو ، یہ باغِ بےخزاں
دیکھا ہے ایک بار ، دوبارہ تو دیکھ لوں

پھر میرے سامنے ہے وہی رات کا سفر
ہوتی ہے شام ، اپنا ستارہ تو دیکھ لوں

مَیں ڈوبتا ہوں یا کہ اُبھرتا ہوں اِس گھڑی
اُس کے اُفق پہ اپنا کنارہ تو دیکھ لوں

وہ اور کا کچھ اور ہُوا جا رہا سہی
کچھ دیر اُس کو رنگ بدلتا تو دیکھ لوں

مجھ کو کہیں سمیٹ بھی سکتا ہے یا نہیں
ساحل پہ جا کے دامنِ دریا تو دیکھ لوں

باقی تو اور کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں مَیں
جو کچھ کیا ہے اُس کا نتیجہ تو دیکھ لوں

کس کس کا بوجھ صبحِ مسافت سے پیشتر
کاندھوں پہ ہے رکھا ہوا ، اِتنا تو دیکھ لوں

عرضِ ہوس میں عار تو کوئی نہیں ، ظفؔر
فی الحال اُس کا اپنا اِرادہ تو دیکھ لوں

ooo

ظفر عجمی

آ کے جب خواب تمہارے نے کہا، بسم اللہ
دِل مسافر تھکے ہارے نے کہا ، بسم اللہ
شام کا وقت تھا اور ناؤ تھی ساحل کے قریب
پاؤں چُھوتے ہی کنارے نے کہا، بسم اللہ
اجنبی شہر میں تھا پہلا پڑاؤ میرا
بام سے جھک کے ستارے نے کہا، بسم اللہ
موت سی سردی تھی جب راکھ میں ڈالا تھا ہاتھ
ایک ننھے سے شرارے نے کہا ، بسم اللہ
لڑکھڑائے جو ذرا پاؤں تو اِک شور ہوا
قافلے سارے کے سارے نے کہا، بسم اللہ
طفل معصوم لپکتا ہوا ، گرنے کو تھا
ہاتھ میں پکڑے غبارے نے کہا، بسم اللہ
شب کٹی خوف کی ، پھر لوگ ہوئے محوِ سفر
سبز ٹہنی کے اِشارے نے کہا ، بسم اللہ
ناخدا چھوڑ گئے ، بیچ بھنور میں تو ظفؔر
ایک تنکے کے سہارے نے کہا، بسم اللہ

ooo

بدن سے رُوح تلک ہم لہو لہو ہوئے ہیں
تمہارے عشق میں اب جا کے سرخرو ہوئے ہیں
ہوا کے ساتھ اُڑی ہے محبتوں کی مہک
یہ تذکرے جو مری جان کُو بہ کُو ہوئے ہیں
وہ شب تو کٹ گئی جو پیاس کی تھی آخری شب
شریک گریۂ شبنم میں اب سبھو ہوئے ہیں
تمہارے حسن کی تشبیب ہی کہی ہے ابھی
چراغ جلنے لگے ، پھول مشکبو ہوئے ہیں
عجیب لطف ہے اس ٹوٹنے بکھرنے میں
ہم ایک مشتِ غبار اب چہار سو ہوئے ہیں
بجا ہے زندگی سے ہم بہت رہے ناراض
مگر بتاؤ خفا تم سے بھی کبھو ہوئے ہیں
میں تار تار ظفؔر ہو گیا ہوں جس کے سبب
فلک کے چاک اِسی فکر سے رفو ہوئے ہیں

ooo

ہم محبت سے بھی ڈرے ہوئے ہیں
تم سے کچھ سوچ کر پرے ہوئے ہیں
شب بھی جنگل بھی ، اور بارش بھی
راستے خوف سے بھرے ہوئے ہیں

کون دیکھے گا تیرے اَشک یہاں		کام یوں بھی کبھی ارے ہوئے ہیں
دے رہا ہوں میں روشنی کی صدا		لوگ کیا شہر کے مرے ہوئے ہیں
رائیگاں اِس قدر ہوئے ہیں ہم		ہارنے والوں سے ہرے ہوئے ہیں
ہم فسردہ دِیے محبت کے		طاقچوں میں ظفؔر دھرے ہوئے ہیں

ooo

خیالِ نور سے سورج بنا رہا تھا میں		تھی رات گہری مگر جگمگا رہا تھا میں
تھا سب پہ خوف مسلط سو یہ ضروری تھا		جہاں کوئی نہیں جاتا تھا ، جا رہا تھا میں
فصیلِ شہر پہ تھا ساری رات میں نگراں		اذان ہونے لگی تھی ، جب آ رہا تھا میں
متاعِ اَشک سے دامن مرا بھرا ہوا تھا		گرا رہا تھا کوئی ، اور اُٹھا رہا تھا میں
میں تنہا نکلا تھا لے کر علَم محبت کا		نظر اُٹھائی تو دیکھا ، ہزارہا تھا میں
میں اُس کا کوئی نہ تھا پھر بھی اُس کے رستے میں		چراغ سب سے چھپا کر جلا رہا تھا میں
چراغدان کے سائے میں ،مَیں پڑا ہوا تھا		سبھی سے چُھپ کے، اُسے دیکھتا رہا تھا میں
ستارہ وار فرشتے مرے طواف میں تھے		کسی کے قدموں میں شب بھر پڑا رہا تھا میں
ستم کی رات تھی ، ہر سمت ہُو کا عالم تھا		میں سن رہا تھا ظفؔر اور گا رہا تھا میں

ooo

رُت ہے پت جھڑ کی تو کیا، خواب تو آتے رہیں گے		بام و در لفظوں کے رنگوں سے سجاتے رہیں گے
سدا آباد رہیں گے یہ محبت کے دیار!		لوگ آتے رہیں گے، شمعیں جلاتے رہیں گے
میری مٹی میں وہ سرچشمہ محبت کا ہے		قافلے صدیوں تلک پیاس بجھاتے رہیں گے
کبھی خوشبو کا سفر ختم نہ ہو گا اپنا		خاک بھی ہو گئے تو پھول کھلاتے رہیں گے
شعلہِ حرف یہ ، اعدا سے نہیں بجھنے کا		شعر کہتے رہیں گے، آگ لگاتے رہیں گے
تم روا رکھو ستم غیر سمجھ کر ہم پر		ہم کبھی دوست بھی تھے، یاد دِلاتے رہیں گے
وحشیو! دیکھ لو انساں کا سفر جاری ہے		بچے گلیوں میں یونہی شور مچاتے رہیں گے

کوئی تخصیص نہیں اپنے پرائے کی ظفؔر
سارے انسانوں کے ہم ناز اُٹھاتے رہیں گے

ooo

عادِل یزدانی

ملال اپنے زمینی ہیں — کہ ہم پودے زمینی ہیں
کبھی دُشمن فلک اپنا — کبھی خطرے زمینی ہیں
ہوئے مسدود جو ہم پر — وہ سب رستے زمینی ہیں
یہ آنسو دردمندوں کے — یہی تارے زمینی ہیں
اَزل سے جو حسیں ٹھہرے — دِلا! رِشتے زمینی ہیں
سماوی مسئلے بھی اَب — ہمیں لگتے زمینی ہیں
مری پرواز میں حائل — مرے ناتے زمینی ہیں
بنے کیوں آسماں ثالث — اگر جھگڑے زمینی ہیں

حقائق زیرِ بحث عادِلؔ
خوشا اَب کے زمینی ہیں

ooo

سرِ صحرا ہے گوش بر آواز — اِک دِوانہ ہے گوش بر آواز
اے خموشی تو اَب تو گویا ہو — ساری دُنیا ہے گوش بر آواز
دَشتِ دِل میں یہ کون آیا ہے — ہر پرندہ ہے گوش بر آواز
جانے کیا دھوپ کہنے والی ہے — ایک سایا ہے گوش بر آواز
دِل سے یونہی صدا نکلتی نہیں — کوئی ہوتا ہے گوش بر آواز
لب پہ آئی ہے یہ دُعا کیسی — ہر فرشتہ ہے گوش بر آواز
کیا سماعت بحال ہے اُس کی؟ — وہ جو لگتا ہے گوش بر آواز
آہٹوں سے کبھی اَٹا تھا جو — اَب وہ رَستا ہے گوش بر آواز

لب کشا کوئی ہو نہ ہو عادِلؔ
مجھ کو رَہنا ہے گوش بر آواز

عارف حسین عارف

میں نے کیا عشق میں حکومت کی
سب نے دِل کھول کر عداوت کی
خود کو چاہا ہے پھر تجھے چاہا
میں نے ترتیب سے محبت کی
اِک نظر پیار سے مجھے دیکھا
اس نے آج آنکھ بھر سخاوت کی
دِل دھڑکتا ہے آنکھ میں اب تک
میں نے یوں خواب میں تلاوت کی
کس لیے دردِ دِل دیا مجھ کو
کس لیے زندگی عنایت کی
یوں تری یاد سے نکل آیا
میں نے اِس ہجر سے بھی ہجرت کی
کون دیتا ہے ساتھ مدت تک
ساری باتیں ہیں بس ضرورت کی
رات کی سانس رُک گئی عارفؔ
جانے کیا تھی گھڑی اذیت کی

OOO

سانس رُکتی ہے تو اِس دِل کا پتا چلتا ہے
جیسے رُک رُک کے کوئی آبلہ پا چلتا ہے
پاؤں پڑتا ہے ترے دھیان میں جس رستے پر
مجھ کو اِک اور ہی دُنیا کا پتا چلتا ہے
میں کنارہ ہوں سو خاموش کھڑا رہتا ہوں
اور تُو پانی ہے کہ پانی تو سدا چلتا ہے
کس خرابے میں اُٹھا لائی ہے وحشت مجھ کو
ریت اُڑتی ہے نہ صحرا کا پتا چلتا ہے
اپنے کردار کے سایے میں تلاشو خود کو
آئینہ دیکھ کے کب اپنا پتا چلتا ہے
چلے جاتے ہیں کئی کام کے انسان مگر
کام دُنیا کا مری جان سدا چلتا ہے
جانے کیوں چہرہ اُتر جاتا ہے عارفؔ ان کا
جب بھی محفل میں کہیں ذکرِ وفا چلتا ہے

OOO

عطا تراب

دلدل تھی زندگی کی سو دھنستا چلا گیا
اور اپنی بے بسی پہ میں ہنستا چلا گیا
اِک نو بہارِ حسن کی آمد سے دِل کا شہر
اُجڑا ہوا دیار تھا ، بستا چلا گیا
پہلے دِکھا رہا تھا مجھے منزلوں کے خواب
پھر میرے سامنے سے وہ رستہ چلا گیا
میں رو پڑا تھا، جس کی جدائی کو سوچ کر
وہ شخص میرے حال پہ ہنستا چلا گیا
میں خود لپٹ گیا تھا جسے دوست جان کر
وہ سانپ کی طرح مجھے ڈستا چلا گیا

ooo

کہیں جمال پزیری کی حد نہیں رکھتا
میں بڑھ رہا ہوں تسلسل سے قد نہیں رکھتا
یہ قبل و بعد کے اُس پار کی حکایت ہے
مرا دوام ازل اور ابد نہیں رکھتا
وہ ایک ہو کے بھی ہم سے گنا نہیں جاتا
وہ ایک ہو کے بھی آگے عدد نہیں رکھتا
یہ عمر بھر کی ریاضت مرا مقدر ہے
تراشتا ہوں جسے خال و خد نہیں رکھتا
وہ اِک سخن ہی ہماری سند نہ بن جائے
وہ اِک سخن جو تمہاری سند نہیں رکھتا
تراؔب کاسۂ دِل پیش کر دیا جائے
سنا ہے کوئی سخاوت کی حد نہیں رکھتا

ooo

علی اعظم شاہ

بن گئی روگ مرے دِل کا جوانی میری ‏ ‏ کیسے کھلتی نہ زمانے پہ کہانی میری
شیر دریا کو کوئی روکنے والا ہی نہ تھا ‏ ‏ لے گیا ساتھ بہا کر وہ نشانی میری
سچ کسی جبر کا پابند نہیں ہوتا ہے ‏ ‏ دار پر دیکھنا تو شعلہ بیانی میری
میری ماں دوڑتی پھرتی تھی برہنہ پاؤں ‏ ‏ ایڑیاں چُومتا کیوں آ کے نہ پانی میری
اب میں کس منہ سے بھلالوٹ کے جاؤں گا وہاں ‏ ‏ مجھ کو بھولی نہ کبھی نقل مکانی میری
تو نے کوثر سے بڑا نام دیا ہے اِس کو ‏ ‏ کتنی انمول ہوئی اَشک فشانی میری
تیرے ہر حکم کو مانا ہے غلاموں کی طرح ‏ ‏ ایک بھی بات مگر تو نے نہ مانی میری

لکھتے لکھتے جو کبھی یاد وہ آئے اعظم!
ختم ہو جائے قلم کی یہ روانی میری

ooo

گھرا ہوا میں اَزل سے کسی غبار میں ہوں ‏ ‏ کبھی حصار سے باہر کبھی حصار میں ہوں
نکلنے دیتا نہیں حلقۂ اثر سے مجھے ‏ ‏ کبھی میں قرب میں اُس کے کبھی جوار میں ہوں
تو مجھ کو ڈھونڈ دِلوں کے سمندروں میں کہیں ‏ ‏ میں تیری چشمِ فسوں کار کے شرار میں ہوں
ترے دیار کا رستہ کہیں نہیں ملتا ‏ ‏ تری تلاش میں صدیوں سے رہگزار میں ہوں
کبھی خزاؤں کی رُت میں نمازِ شب کا سکوت ‏ ‏ کبھی اذانِ سحر کی طرح بہار میں ہوں
کہاں رہا ہوں میں زندہ کہ مجھ کو مارتی موت ‏ ‏ پڑا ہوا میں ازل سے فنا کے غار میں ہوں

میں اُس کے ناوکِ مژگاں سے بچ نہیں سکتا
کسی طرف بھی نکل جاؤں اُس کی مار میں ہوں

ooo

علی نقی خان

دِل کے جذبوں کو ترے سامنے لایا نہ گیا
ہم سے بازار محبت کا لگایا نہ گیا

دہر میں لٹتے رہے قافلے اُمیدوں کے
دِل سے خوشیوں کا یہ احساس مٹایا نہ گیا

عمر بھر تیشۂ مزدور کی دِل داری سے
شہریاروں تلک ادبار کا سایہ نہ گیا

لوٹنے والے نے اس طور سے لُوٹی ہے حیات
ایک بھی سانس کا سرمایہ بچایا نہ گیا

ہم نے اُلفت میں غمِ یار کو کافی جانا
سر کسی طور محبت کا جھکایا نہ گیا

صبح کے ساتھ ترے چہرے کی رنگت اُتری
آخرِ شب بھی دیا دِل کا بجھایا نہ گیا

ooo

چاندنی خاک پر جواں دیکھی
ہم نے فُرقت کی شب کہاں دیکھی

زندگانی کی جستجو نہ رہی
تیری صورت اگر عیاں دیکھی

سینۂ آرزو ہوا چھلنی
جوئے خوں آنکھ سے رواں دیکھی

جو بھی جینے گیا نہیں آیا
زیست کچھ ایسے بے اماں دیکھی

وہ جو بچھڑا تو پھر نہ دِیپ جلے
دِل کی بستی دُھواں دُھواں دیکھی

دِن جیا اور رات مرتے رہے
کیا نقیؔ شورشِ جہاں دیکھی

ooo

عمران شناور

انجان لگ رہا ہے مرے غم سے گھر تمام حالانکہ میرے اپنے ہیں دیوار و در تمام
صیّاد سے قفس میں بھی کوئی گلہ نہیں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹے ہیں پَر تمام
کب سے بلا رہا ہوں مدد کے لیے انہیں کس سوچ میں پڑے ہیں مرے چارہ گر تمام
جتنے بھی معتبر تھے وہ نامعتبر ہوئے رہزن بنے ہوئے ہیں یہاں راہبر تمام
دل سے نہ جائے وہم تو کچھ فائدہ نہیں
ہوتے نہیں ہیں شکوے گلے عمر بھر تمام

ooo

ستارے سب مرے، مہتاب میرے ابھی مت ٹوٹنا اے خواب! میرے
ابھی اُڑنا ہے مجھ کو آسماں تک ہوئے جاتے ہیں پَر بے تاب میرے
میں تھک کر گر گیا، ٹوٹا نہیں ہوں بہت مضبوط ہیں اعصاب میرے
ترے آنے پہ بھی بادِ بہاری گلستاں کیوں نہیں شاداب میرے
بہت ہی شاد رہتا تھا میں جن میں وہ لمحے ہو گئے نایاب میرے
ابھی آنکھوں میں طغیانی نہیں ہے ابھی آئے نہیں سیلاب میرے
سمندر میں ہُوا طوفان برپا سفینے آئے زیرِ آب میرے
تو اب کے بھی نہیں ڈوبا شناورؔ
بہت حیران ہیں احباب میرے

ooo

غائرعالم

کوئی آواز ، اِشارہ نہ کوئی نقشِ خیال
سازِ دِل چھیڑنے والے مرے اوسان سنبھال

دیدۂ شوق سے نکلے ہے رگِ جاں کا لہو
اِتنی قربت نہ مرے ہجر کے پہلو سے نکال

تو کہاں ہے مری آنکھوں میں سمانے والے
سرِ اِمکاں سے گزرتی ہے تری موجِ خیال

دیکھ کر شاخِ نشیمن پہ شگوفوں کے نشاں
عمر بھر عہدِ تغیّر سے کیا کسبِ کمال

عالمِ بے خبری صورتِ حالات میں ہے
پوچھیے کس سے کہ درپیش ہے کیا صورتِ حال

اپنے چہرے پہ نہ پڑنے دی نظر ساقی نے
ڈال پیمانے میں اِک بادۂ خوں ناب کی چال

سرِّ اسرار جھلکتا ہے مرے چہرے میں
صاحبِ قطبِ زماں اے کہ مری وجہِ وصال

ooo

کہیں بجھ گئی رہِ دوستاں کہیں کھو گئے مرے مہرباں
فقط ایک درِ فِراق ہے لیے پھر رہا ہے کُشاں کُشاں

کسی طور دامنِ تنگ سے کوئی چاک نکلے تو خوب تر
سرِ چشمِ حسن و جمال ہے ابھی دردِ نو کا گہر فشاں

گلِ تر کو شاخِ نہال پر تھا نہ جانے کس سے معاملا
یونہی بادِ صبح نے چھو لیا تو ہزار اَشک ہوئے رواں

بڑا مان تھا دلِ زار پر اُسے کھینچ لائے گا ایک دِن
مگر آج دیکھا تو دہر میں ہے کشیدہ سر وہی نوجواں

یہ سحر کے نُور کی چاندنی یہ ہوائے سرد کی راگنی
یہ خمار خانۂ شبنمی یہ نمودِ ساعتِ بوستاں

ooo

غزالؔی

ٹوٹتے جاتے ہیں پیمان تمہارے سارے
بجھتے جاتے ہیں اُمیدوں کے ستارے سارے

کوئی زحمت کسی دُشمن کو اُٹھانا نہ پڑی
مہرباں ہم پہ رہے دوست ہمارے سارے

عصرِ موجود کی بے رحم ہوا کے جھونکے
لے گئے چھین کے بچوں کے غبارے سارے

وسعتِ فکر و تخیل کے سزاواروں نے
تنگ دستی میں شب و روز گزارے سارے

ایک اِک کر کے جدا ہو گئے یارانِ حسیں
وقت نے چھین لیے دِل کے سہارے سارے

منفعت میری ترے نام غزالؔی ساری
ڈال دے تو مرے کھاتے میں خسارے سارے

OOO

فقط بنجر زمینوں پر حکومت کون کرتا ہے؟
غزالؔی ہم غریبوں سے محبت کون کرتا ہے؟

کبھی بھونچال کے ڈر سے کبھی سیلاب کے ڈر سے
یہاں آرام سے ترکِ سکونت کون کرتا ہے؟

نظر رکھے جہاں جب ہر کوئی اوروں کے عیبوں پر
وہاں بے عدل حاکم سے بغاوت کون کرتا ہے؟

مقید ہو کے خود سے گفتگو کرتا ہوں میں پھر بھی
زمانے میں نہ جانے میری شہرت کون کرتا ہے؟

فقط آنکھیں چھلکتی ہیں غموں کی ترجمانی کو
وگرنہ دوسرا غم کی وضاحت کون کرتا ہے؟

مری بستی کے مفلس پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں
مری بستی میں آ کر یہ سخاوت کون کرتا ہے؟

کوئی انعام کا بھوکا ، کوئی دستار کا طالب
تمہیں معلوم ہے ظالم کی بیعت کون کرتا ہے؟

ہمیشہ دِن گزرتے ہیں گزارے کے لیے اپنے
غزالی چین سے جینے کی حسرت کون کرتا ہے؟

OOO

غلام شبیر اسدؔ

جو پیکر میں اُتارے جا رہے تھے
حقیقت میں تو مارے جا رہے تھے

یہ فرقت بھی غبارِ شام تھی کیا
سرِمژگاں ستارے جا رہے تھے

جنوں کی فصل نے جب آنکھ کھولی
خرد کے سب نظارے جا رہے تھے

یہ آوازِ نفس بانگِ درا تھی
مگر بے سمت سارے جا رہے تھے

خزاں کے ہاتھ پیلے ہو رہے تھے
درختوں کے سہارے جا رہے تھے

یہ قربت تو اَزل سے بے ثمر تھی
جو پہلو میں کنارے جا رہے تھے

اسدؔ ہم پر تو اِک لمحہ تھا بھاری
وہ روز و شب گزارے جا رہے تھے

ooo

ہے ایک رنگ و بو کا سہارا گلوں کے پاس
اور رنگ و بو ہیں اپنی حقیقت میں اِلتباس

پھر بھی نبود و بود میں اُلجھا دیئے گئے
یہ جانتے ہوئے کہ عدم سے ہیں اقتباس

خود ہی جدائی دے کے مجھے ڈھونڈتا ہے اب
حالانکہ ہم ازل سے ہیں اِک دوسرے کے پاس

میری نظر میں حُسن نہیں اِک فریب ہے
دیکھیں جسے تو چشم کے قائم رہیں حواس

شبیرؔ اہلِ صبر کی عظمت رہے دوام
منزل نہ پائے گی کبھی پانی کی یہ پیاس

ooo

ترے ملنے کا کیسا مرحلہ تھا
ہمہ رقصِ جہاں سہما ہوا تھا

سرِ افلاک تنہا کر دیا تھا
تجھی تو میں ستاروں سے خفا تھا

ترے ہی حوصلے تھے پست ورنہ
بہت کم فاصلے پہ میکدہ تھا

جسے اِک جست سمجھا تھا جہاں میں
وہ صدیوں کو محیط اِک راستہ تھا

جنوں کی بے نیازی پر گریباں
بدن کے دشت پر بکھرا ہوا تھا

بہت خوش تھا سوادِ دلبراں جو
مجھے ملتے ہی وہ کیوں رو دیا تھا

ہمیں شبیرؔ کہنا پڑ رہا ہے
یہ جینا بس ہمارا حوصلہ تھا

قمر رضا شہزاد

کیا میں ہی ٹھیکروں بھری دُنیا اُٹھاؤں گا میں اور کتنی دیر یہ کاسہ اُٹھاؤں گا
ظاہر کروں گا آئینہ و عکس کا فریب اے عشق تیرے راز سے پردہ اُٹھاؤں گا
رہنے دے اپنے خانۂ دِل میں ذرا سی دیر میں کون سا یہاں سے خزانہ اُٹھاؤں گا
کیوں تو نے میرے سر پہ دھری اپنی کائنات کیسے میں اِتنا بوجھ اکیلا اُٹھاؤں گا
یہ سوچ کر بھی چھوڑ دِیئے جمع کرنے خواب جاتے ہوئے یہاں سے میں کیا کیا اُٹھاؤں گا
میری ہنسی کا شور جو سب سے بلند ہے
شاید میں دُکھ بھی سب سے زیادہ اُٹھاؤں گا

OOO

حسابِ سود و زیاں پاک کر دیا گیا ہے ہمارا شعلۂ جاں خاک کر دیا گیا ہے
یہ کیسا جبر کہ مٹی پہ رہنے والوں کو اسیر گردشِ افلاک کر دیا گیا ہے
لہو سے نقش و نگارِ جہاں بناتا ہوں یہ کس قدر مجھے سفّاک کر دیا گیا ہے
میں اس غبار میں کُھبنے لگا ہوں سو شہزآد
یہ عشق ہی مری پوشاک کر دیا گیا ہے

OOO

کوئی اس خاک پر کہاں رہے گا اِک ترا حُسن جاوداں رہے گا
ہم تو ہو جائیں گے الاؤ کی نذر اور تو زیبِ داستاں رہے گا
طاق میں رکھ دیا گیا ہے چراغ جانے کب تک وہ ضوفشاں رہے گا
آگ تو بجھ ہی جائے گی لیکن عمر بھر آنکھ میں دُھواں رہے گا
عشق آزار ہی سہی شہزآد
یہ مرے خون میں رواں رہے گا

کاشف نعمانی

یہ اپنی مسندِ دِل اور یہ ولایتِ خواب
ترے سپرد کی ، اے خوش ادا! حکومتِ خواب
مہکتا رہتا ہوں دِن بھر، میں اُس کی خوش بو سے
چلی ہے، جس گلِ تازہ سے ، یہ روایتِ خواب
وہ کوئی سیرِ طلسمات تھی ، کہ جسم اُس کا!
ہے آج تک مری آنکھوں میں عکسِ حیرتِ خواب
سو،خواب میں بھی ، وہ روتی ہوئی نظر آئی
کہ چشمِ نم پہ ہے، اب تک، مدارِ رویتِ خواب
سفر ضرور کیا تھا ، مگر نہیں معلوم!!
وہ محض خوابِ مسافت تھا ، یا مسافتِ خواب
میں خطِ سرحدِ وہم و یقیں پہ واقع ہوں
کہ جاگتے میں بھی رہتی ہے مجھ پہ حالتِ خواب

○○○

کبھی نہ اُس نے جلا کر ، چراغِ وعدہ ، رکھا
خیال ، ہم سے زیادہ ، تو پھر ، ہوا کا ، رکھا
رِدائے فقر میں سمٹے رہے ، یہ ہجر نصیب
نہ گھر بنایا ، نہ اسباب ہی زیادہ رکھا
نہ اُس نے ہم کو کسی اور کام کا چھوڑا
نہ اپنی وحشتِ دِل نے ،ہمیں کہیں کا رکھا
نہ جانے کون سے رستے سے،اُن کو آنا ہے!
کسی پہ آنکھیں رکھیں اور کسی پہ چہرہ رکھا
عجیب دربدری میں ، گزر گئے شب و روز
عجیب غم تھا ،ہمیں جس نے ، رُوگرفتہ رکھا
سوادِ شب کا سفر تھا ،سو ہم نے رختِ سفر
بس ایک تیغ رکھی اور اِک ستارہ رکھا

○○○

عمر بھر ایک بد اَطوار کے پیچھے بھاگوں
کب تلک یوں، میں دِلِ زار کے پیچھے بھاگوں
کبھی جاتا نہیں،خود اُس کے بلانے پہ بھی میں
کبھی اُس کے لیے، اغیار کے پیچھے بھاگوں
کچھ نہیں کھلتا ، کہ آخر مجھے مطلوب ہے کیا!
کبھی سایے ، کبھی دیوار کے پیچھے بھاگوں
اِس قدر سہل نہ ہو ، مجھ پہ ، کہ اُکتا جاؤں
اور تجھے چھوڑ کے ، دُشوار کے پیچھے بھاگوں

دِل میں جب فکرِ کم و بیش ہی ، باقی نہ رہی		پھر میں کیا وافر و بسیار کے پیچھے بھاگوں
یہی دُنیا تھی ، جو کل تک ، مری ٹھوکر پہ رہی		کیا میں اب پھر اُسی مردار کے پیچھے بھاگوں!
مجھ میں اور لوگوں میں ، پھر فرق ہی کیا رہ جائے
میں بھی ، گر درہم و دینار کے ، پیچھے بھاگوں

ooo

صورتِ اِندمال ، سوچتے ہیں		اے دلِ خستہ حال! سوچتے ہیں
ایسی بے مائگی میں ، کیسے ہو		بندوبستِ وصال ، سوچتے ہیں
جانے کس دِن اِدھر سے گزرے گی		اب وہ بادِ شمال ، سوچتے ہیں
پھول سے دِل میں کھلنے لگتے ہیں		جب بھی اُس کی مثال ، سوچتے ہیں
پہروں بیٹھے ، ہم ، اُس کے بارے میں		اُلٹے سیدھے سوال ، سوچتے ہیں
سوچتے ہیں ، کبھی جوازِ تپاک		کبھی وجہِ ملال ، سوچتے ہیں
کیا کہیں ! زیرِ دام لانے کے		کیسے کیسے خیال ، سوچتے ہیں
جس کے کرنے سے لوگ عاجز ہوں		ہم وہ کارِ محال ، سوچتے ہیں
کچھ نہ کر پائے ، پچھلے سال بھی ہم
دیکھو! کیا! اب کے سال ، سوچتے ہیں

ooo

ایسا شور برپا تھا ، پچھلی رات ، دریا میں		جیسے گرنے والا ہو ، آسمان ، دریا میں
وقت کی عناں تھامے ، بادلوں میں اُڑتے تھے		اور دِکھائی دیتا تھا ، ماہتاب ، دریا میں
اوٹ میں درختوں کی ، چاندنی تھی اور میں تھا		خوب ہی نہائے ہم ، ایک ساتھ ، دریا میں
اِس طرح بہائے تھے ، زرد پھول پانی میں		جیسے اُس نے لکھا ہو ، میرا نام ، دریا میں
ایسی چاندراتوں میں ، ہم ہی کیا! کہ ہوتے ہیں		آگ اور پانی بھی ، ہم کنار ، دریا میں
کچھ تو پہلے ہی اُس کی راہ میں بچھا دی تھی		اور کچھ بہا دی ہے ، اپنی خاک ، دریا میں
ہم تو اُس کی آنکھوں میں ، ایک بار ڈوبے تھے
غرق ہو گئے کتنے ، ماہ و سال ، دریا میں!!

ooo

کامی شاہ

یہ سب زمین کے موسم ، یہ ''آسمانِ قدیم''
مرے وجود سے قائم ہے یہ جہانِ قدیم

سمے کے ساتھ مَیں پھیلا ہوا ہوں تا بہ اَبد
مری نگاہ میں رکھے ہیں سب زمانے قدیم

میں حرص و خوف کو کیسے الگ کیا خود سے
کبھی سناؤں گا تم کو یہ داستانِ قدیم

فلک نژاد ستاروں کے سلسلے سے اُدھر
مرا چراغ بنایا ہے اُس خدا نے قدیم

کھلا ہوا ہے ہمیشہ برائے دل زَدگاں
یہ خوابِ زارِ محبت ، یہ آستانِ قدیم

تری گلی میں بھی ہنگامۂ ہوس ہے وہی
کھلی ہوئی ہے یہاں بھی وہی دُکانِ قدیم

یہ دِل ، یہ سینۂ آدم میں روشنی کا سراغ
یہ سنگِ سرخ ہے کامؔی مرا نشانِ قدیم

OOO

وہی مٹی بھرا پانی ، وہی پانی بھری مٹی
وہی کوزہ گری کو دیکھتی حیران سی مٹی

یہی مٹی نظر آتی ہے دریا اور صحرا میں
سرابوں اور گلابوں میں مہکتی ہے یہی مٹی

محبت نے کیا روشن زمانوں اور مکانوں کو
محبت سی ہوئی روشن ہماری سرمئی مٹی

تمہیں یہ دیکھ لے گی تو بہت آرام پائے گی
تمہاری راہ میں جو اُڑ رہی ہے باولی مٹی

ہمارا منتظر ہو گا کوئی سیّارۂ راحت
نیا ہو گا وہاں پانی ، وہاں ہو گی نئی مٹی

ہم اپنا سبز پیراہن وصولیں گے وہاں جا کر
وہاں پر رنگ بدلے گی ہماری کاسنی مٹی

تمہارے سر میں یہ جو کُودتی ، اُودھم مچاتی ہے
یہ خود سے آشنا کب ہے تمہاری سر پھری مٹی

ہم اپنا خواب کہتے ہیں ، ہم اپنا راز کہتے ہیں
ہماری سامعہ ہے یہ کھنکتی ، گونجتی مٹی

OOO

گستاخ بخاری

کم سے کم آسماں اُتار کے دیکھ
میری دُنیا کبھی سنوار کے دیکھ

ریت خود زندگی سے عاری ہے
آب صحرا سے مت گزار کے دیکھ

یہ ترے ساتھ ساتھ رہتا ہے
اپنا سایہ کبھی پکار کے دیکھ

پاؤں رنگین تتلیوں کے ہوئے
رنگ اُڑتے ہوئے بہار کے دیکھ

کر عقیدت کے زخم کو تازہ
سنگ بے نقش اِک مزار کے دیکھ

اپنی قسمت سے صرف مطلب رکھ
تو تعلق نہ شہریار کے دیکھ

راستہ چاہتا ہے گم ہونا
رُک کے مت ولولے غبار کے دیکھ

صاف منظر نگاہ تک پہنچے
آئنے کو ذرا نکھار کے دیکھ

تجھ پہ تاثیرِ حسن کھل جائے
زاویے سارے شاہکار کے دیکھ

یوں ہی گستاخ سے نہ کر اغماض
صبر تو ایسے بے قرار کے دیکھ

ooo

کس قدر جان جلائی میری
آگ نے راکھ اُڑائی میری

میں سرابوں کے سفر پر نکلا
آب پر رہ گئی کائی میری

یہ بھی خوش کُن ہے چلو صدیوں بعد
آپ کو یاد تو آئی میری

دِل چرانے کا ہوا تب معلوم
تو نے جب نیند چرائی میری

مار دے گی یہ قفس کی اُلفت
اب اگر ہو گی رہائی میری

میں تری رُوح لیے پھرتا ہوں
ہے کہاں جان پرائی میری

درد سے چیخ رہے ہیں رستے
ہے رواں آبلہ پائی میری

سوز کو سینۂ مضراب میں ڈال
دے گی آواز سنائی میری

شکر ہے یاد تو رکھتا ہے مجھے
کرتا رہتا ہے برائی میری

شوکتِ شعروسخن دیکھتا ہوں
یہ ہے گستاخ کمائی میری

گُل بخشالوی

میری محبوبہ مجھے حُوروں سے بھی اچھی لگی
اس لیے اب زندگی سے دوستی اچھی لگی

رُوپ میں اُس کے سمایا چودھویں کا چاند ہے
اُس کی آنکھوں میں غزل کی دِل کشی اچھی لگی

عشق میں دُنیا کا اور نہ زندگی کا خوف ہے
ہم کو اپنے فکروفن کی خودکشی اچھی لگی

آ رہی ہے کیا مہک پھولوں کی ہر دیوار سے
شہر میں اُس گل بدن کی ہر گلی اچھی لگی

رکھ کے چہرے پر وہ دونوں ہاتھ شرمانے لگی
اُنگلیوں کے درمیاں سے دیکھتی اچھی لگی

لے کے ہچکولے گلوں کے سنگ مدہوشی میں وہ
تتلیوں سے باغ میں وہ کھیلتی اچھی لگی

عید کے دِن آ گئی وہ گل سے ملنے عید تو
اُس کی ہاتھوں میں رچی مہندی بڑی اچھی لگی

ooo

پنگھٹ پہ بل کھاتی جاتی سکھیوں کے سنگ آئے
پربت پر جھرنے کی صورت دِل سے نکلے ہائے

بولے تو شرما جاتی ہے سندر بن کی کوئل
سولہ سن کی جیون رُت میں چندا کو شرمائے

زلفِ مشکیں میں وہ مکھڑا جیسے گھٹا میں چاند
ایسا سندر مکھڑا کوئی بستی میں دِکھلائے

رُوپ نگر کی رانی سے جب دِل چاہے میں بولوں
جھیل کنول کی ناگن بن کر ڈسنے کو بل کھائے

گال گلابی، آنکھ شرابی ، منہ میں چمکیں موتی
اُف اللہ قربت کا منظر ، برف بدن پگھلائے

مہک اُٹھے گی صحرانگری ، دِل دوزخ ہو جنت
رُوپ کی رانی،ندی کنارے،بانہوں میں آجائے

حسن کی پاگل بستی میں گلؔ ،اپنی ہے یہ حالت
جیسے پھول کے دِل سے تتلی رس پی کر اُڑ جائے

ooo

گلفام نقوی

زخم جب بھی کھاتے ہیں کھل کے مسکراتے ہیں
غم کی کالی راتوں میں اَشک جگمگاتے ہیں
دوسروں کی آتش میں خود کو ہم جلاتے ہیں
کب وہ اس طرح کے ہیں جو نظر وہ آتے ہیں
دوستوں کی محفل میں غیر یاد آتے ہیں
زندگی کہیں کیسے وہ جو ہم بِتاتے ہیں
سچ سنا کے اَپنوں کا ظرف آزماتے ہیں
گلؔ کسی کی یادوں میں
خود کو بھول جاتے ہیں

OOO

جب زمانہ بدل چکا ہو گا تو اگر آئے بھی تو کیا ہو گا
ہوش آیا تو ہاتھ خالی ہیں وقت آگے نکل گیا ہو گا
ناؤ ڈوبے گی عین ساحل پر آپ جیسا جو ناخدا ہو گا
رُوٹھ جائیں گے ساری دُنیا سے تو کبھی ہم سے جو خفا ہو گا
ہاتھ اِک تیرے ہاتھ میں ہو گا دوسرے ہاتھ میں دِیا ہو گا
آج کہہ دو ہمیں جو کہنا ہے کون جانے کہ کل کو کیا ہو گا
جو تجھے یاد بھی نہیں ہے گلؔ
کھو کے تجھ کو وہ کیا جیا ہو گا

OOO

لیاقت علی عہدؔ

آؤ تجدیدِ وفا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں
پھر درِ اُمید وا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

ہار دی ہمت تو یونہی بے نشاں رہ جاؤ گے
اپنی آہوں کو صدا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

نفرتوں کے اس جہاں میں، سازشوں کے شہر میں
پیار کرنے کی خطا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

غم کی لمبی رات کی بس اب سحر ہونے کو ہے
دِل خوشی سے آشنا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

رسمِ دُنیا ہے نبھانی ہی پڑے گی دوستو
پتھروں سے اِلتجا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

طوقِ رُسوائی خوشی سے ہم گلے میں ڈال لیں
عشق کا یوں حق ادا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

مصلحت کے نام پر ہو دُشمنوں سے دوستی
جو نہیں اب تک کیا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

دِل بہل جائے گا اور کچھ بات بھی ہو جائے گی
ذِکر گزرے عہدؔ کا ، تم بھی کرو ، ہم بھی کریں

ooo

بے وفا کی بھولی صورت ، یاد آتی ہے مجھے
ترک کرنے پر محبت ، یاد آتی ہے مجھے

وقتِ رُخصت مانتا ہوں تیرے لب خاموش تھے
کی جو آنکھوں نے شکایت ، یاد آتی ہے مجھے

وہ اچانک چونک جانا راہ چلتے میں ترا
بھولنے کی تیری عادت ، یاد آتی ہے مجھے

غم کی تپتی دھوپ تھی اور سائباں کوئی نہ تھا
دشتِ جاں میں دِل کی حالت ، یاد آتی ہے مجھے

ہائے وہ کیا وقت تھا جب ہم سراپا عشق تھے
غم کے ہاتھوں دِل کی شامت ، یاد آتی ہے مجھے

بھول جاتا ہوں تجھے اکثر ، کہ میں انسان ہوں
پھر بھی تُو ''حسبِ ضرورت'' یاد آتی ہے مجھے

اس طرح پہلے تڑپنے پر تو پابندی نہ تھی
عہدِؔ ماضی کی سہولت ، یاد آتی ہے مجھے

ooo

مامون ایمن

دَم بہ دَم زندگی ہے میرے ساتھ دِن بھی ہے، رات بھی ہے میرے ساتھ
گم رہی کا سراغ رکھتا ہوں اِس لیے آ گہی ہے میرے ساتھ
مَیں نہیں جاگتا کبھی تنہا رات بھی جاگتی ہے میرے ساتھ
آئنہ ، عکس سے جدا ٹھہرا آشنا ، اجنبی ہے میرے ساتھ
چھپ کے خود سے مَیں رو بھی لیتا ہوں اِک انوکھی ہنسی ہے میرے ساتھ
دِل میں ، ایمنؔ! سراب یادوں کی
ایک بستی بسی ہے میرے ساتھ

ooo

فراق و وصل کے قصے کہاں تک حقیقت سے جہاں اُلجھے کہاں تک
کوئی تعبیر تو ہو ، ہاؤ ہو میں زمانہ خواب ہی دیکھے کہاں تک
ڈبو دے گی خطا اس کو بھی آخر وفا ، سیلِ جفا روکے کہاں تک
دِلاسا دے کہاں تک آس کو جاں صبا دیوار کو تھامے کہاں تک
مٹاتے جائیں گے خود کو خوشی سے سرابوں کے لیے رستے کہاں تک
طلب خوش بو ہے سانسوں کی ، زباں سے چھپا کر خامشی رکھے کہاں تک
بتاؤ تو سخن کی رہ گزر میں
میاں ایمنؔ! بھلا پہنچے کہاں تک

ooo

مبارک اکمل گیلانی

یہ طوفانِ طلسمِ ماسوا ہُو — خرد آئینۂ حیرت ہے یا ہُو
کوئی آواز باقی ہے نہ حرکت — مکاں تا لامکاں ہے اِک صدا ہُو
میانِ این و آں سب موہ مایا — کہ ہے ہر اِبتدا کی اِنتہا ہُو
وہی میرا بھرم ، میرا حوالہ — کہ میں ہوں خاک پر میری اَنا ہُو
اسی کی روشنی رستہ یقیں کا! — گماں کی رات میں روشن دِیا ہُو
سرِ راہِ فنا میں ذرۂ ریگ — مری لوحِ جبیں پر نقشِ پا ہُو
مری ہر سانس ، ہر دھڑکن میں جاری — وہی اِک درد ، وہ اِک ماجرا ہُو
رسائی ، نارسائی سب اُسی کی — وہی منزل ، وہی ہے رہ نما ، ہُو

میں کب کا گر چکا ہوتا پر اکملؔ
مجھے تھامے ہوئے ہے وردِ یا ہُو

ooo

کبھی تو ہم سے کسی روز مشفقانہ ملیں — یہ کیا کہ جب بھی ملیں یوں مخاصمانہ ملیں
ہم اہلِ عجز کبھی سر اُٹھا بھی سکتے ہیں — یہی نہیں کہ ہمیشہ مؤدبانہ ملیں
ہمارے جیسے کو یہ آسرا ہی کافی ہے — کہ درمیاں کبھی حائل نہ ہو زمانہ ملیں
پناہ گر نہیں ممکن تو کیا ضروری ہے — کہ آئندہ جو ملیں تو منافقانہ ملیں
جو زعمِ حسن سے فرصت کبھی میسر ہو — تو کشتگان سے اپنے مساویانہ ملیں
ہماری وضعِ مروّت سے یہ نہیں ممکن — کہ جس سے دِل نہیں ملتا ہو بے دِلانہ ملیں
اب اُس کے حُسنِ مدارات کی شکائت کیا — ہزار بار تو ہم نے یہی کہا ، نہ ملیں
بس اِک نظر کے لیے، ایک غمزہ بھر کے لیے — کوئی سبیل ، بنا کر کوئی بہانہ ملیں

اسے لکھا تو ہے اکملؔ پہ دیکھیے کیا ہو!
''کھڑا کریں نہ کہیں کوئی شاخسانہ ، ملیں''

محبوب الٰہی عطاؔ

اَشک بن کر آنکھ میں آئے وہ آ کر بہہ گئے
دیدۂ تر میں اُنھیں ہم دیکھتے ہی رہ گئے
جس کا عنواں سوچتے ہی رہ گئے اہلِ خرد
ہم جنوں میں وہ محبت کا فسانہ کہہ گئے
لے گیا دیوارِ جسم و جاں کو سیلِ دردِ دِل
اپنے ہی اندر کے ہم طوفاں میں آخر بہہ گئے
وائے قسمت وہ نظر اُٹھی تھی اُٹھ کر رہ گئی
ہم مقدر کے سکندر ہوتے ہوتے رہ گئے
جن کی دہشت سے فلک بھی کانپ اُٹھتا ہے عطاؔ
ہم جنوں میں وہ قیامت خیز غم بھی سہہ گئے

ooo

دِکھلا کے جھلک باعثِ آرام نہ ٹھہرا
کیوں چاند مرا آ کے لبِ بام نہ ٹھہرا
ہیں عشق میں بے نام ونشاں وہ بھی کہ جن کی
ٹھہری نہ کوئی ذات کوئی نام نہ ٹھہرا
پھوٹی نہ کرن وقتِ سحر دِل کے اُفق سے
آنکھوں میں کوئی خواب سرِ شام نہ ٹھہرا
رہتا تھا مرے ساتھ جو ہر جرم میں شامِل
حیرت ہے کہ وہ موردِ الزام نہ ٹھہرا
ہوں عشق کی وہ راہِ پُراسرار کہ جس کا
آغاز نہ ٹھہرا ، کوئی انجام نہ ٹھہرا
صد شکر عطاؔ مطلعِ انوار ہنر میں
وہ لفظ ہوں جو صورتِ ابہام نہ ٹھہرا

ooo

جب دِل کے آئنے میں وہ جلوہ نما ہوا
سر تا قدم تھا میں بھی تجلی بنا ہوا
اُن کے حضور پیش کروں بھی تو کیا کروں
اِک درد ہے سو وہ بھی اُنھی کا دِیا ہوا
چننی پڑیں گی آپ کو پلکوں سے کرچیاں
میرا وجود آئنوں میں ہے بٹا ہوا
طوفان تھم بھی جائے اگر بحرِ عشق میں
کیسے لگے گا پار سفینہ جلا ہوا
مُدّت ہوئی کہ آگ بگولا ہیں اے عطاؔ
جانے یہ میرے دِل کے شراروں کو کیا ہوا

محمد حنیف

اُٹھو اے دِل زدگاں آسماں بنانا ہے
ہمیں اُڑا کے دھواں آسماں بنانا ہے

زمیں بنانی ہے ہم کو برائے دربدراں
برائے گم شدگاں آسماں بنانا ہے

جو بے مکان ہیں وہ جانتے ہیں یہ باتیں
مکاں بنانا یہاں آسماں بنانا ہے

بنا رہے ہیں مگر کچھ سمجھ نہیں آتا
کہاں زمین کہاں آسماں بنانا ہے

یہ اور بات کہ ہم سے کبھی بنے نہ بنے
مگر اے جانِ جہاں آسماں بنانا ہے

ابھی سے کرنے لگے ہو تھکان کی باتیں
ابھی تو ہمسفراں آسماں بنانا ہے

ہمارے سَر میں یہ سودا ہے ایک مدت سے
جہاں نہیں ہے وہاں آسماں بنانا ہے

ooo

ترا مکان تو بس راستے میں آیا ہے
یہ آسمان تو بس راستے میں آیا ہے

ترے جہان میں میرا نہیں ہے کوئی کام
ترا جہان تو بس راستے میں آیا ہے

کئی دِنوں سے ترا دھیان ہی نہیں آیا
مجھے یہ دھیان تو بس راستے میں آیا ہے

یہاں قیام بہت مختصر رہے گا مرا
یہ خاکدان تو بس راستے میں آیا ہے

نہیں مِلا ہے مجھے میری کوششوں کے سبب
وہ خوش گمان تو بس راستے میں آیا ہے

گزر رہا تھا سفر کس قدر سکون کے ساتھ
یہ اِمتحان تو بس راستے میں آیا ہے

ooo

محمد سفیان صفی

ترے رُخ کا سویرا ہے جہاں تک
بصارت کام کرتی ہے وہاں تک
بدن لپٹا ہے شعلوں میں ہمارا
نظر آتا نہیں لیکن دُھواں تک
تمہارا نام لب پر آتے آتے
معطر ہو گئی میری زباں تک
غبارِ شب پہنچنا چاہتا ہے
تھکی ہاری سحر کے کارواں تک
وہی اب سوئے مقتل جا رہا ہے
جو رستہ تھا ہمارے آشیاں تک
تمہاری عنبریں خوشبو نہ پہنچی
مرے احساس کے آبِ رواں تک
ادا ہو جاتی ہیں میری نمازیں
میں اب رہتا نہیں تیری اذاں تک
صفؔی لے جائے گا اِک دِن اُڑا کر
کوئی بادل ہمیں بھی آسماں تک

ooo

جس آئینے کو میں اپنا نشاں سمجھتا تھا
وہ آئینہ مجھے وہم و گماں سمجھتا تھا
ادا نمازِ محبت بہر ادا کی تھی
میں تیری جنبشِ مژگاں اذاں سمجھتا تھا
وہ ایک شخص جو تھا آنسوؤں کا سوداگر
ہماری چشمِ دُر افشاں دُکاں سمجھتا تھا
کچھ اِس طرح تھی مسلسل زمین کی گردش
جو رُک گیا میں اسے بھی رَواں سمجھتا تھا
تھی مشتِ خاک مری پُرفشاں سرِگلشن
میں اِس غبار کو بھی آسماں سمجھتا تھا
ہمیں بنایا گیا تھا محبتوں کا سفیر
ہر اِک پرندہ ہماری زباں سمجھتا تھا
میں اِک چراغ تھا اور جل رہا تھا گھاٹی میں
مرا وجود ستارہ دُھواں سمجھتا تھا
سو اُس نے کھول دیئے دھوپ کے کواڑ صفؔی
میں اُس کے سائے کو اپنا مکاں سمجھتا تھا

ooo

محمد ضیاءاللہ قریشی

وہ کیا دے کسی کو دُعا زندگی کی جیسے مِل رہی ہو سزا زندگی کی
کہ سُن کر جسے نم نہ ہوں میری آنکھیں کوئی بات ایسی بتا زندگی کی
مری خواہشوں کے دِیے بجھ گئے ہیں چلی ہے کچھ ایسی ہوا زندگی کی
مری جان یہ بھی تری اِک اَدا ہے کروں اور تعریف کیا زندگی کی
چلو پھر اُسی شہر کو لوٹ جائیں جہاں سے ہوئی اِبتدا زندگی کی
ضیاء آج وہ شخص بھی مر گیا ہے
جو کرتا تھا باتیں سدا زندگی کی

OOO

تنہا گھر سے باہر جانا ٹھیک نہیں تم معصوم ہو اور زمانہ ٹھیک نہیں
ایسی چیزیں دُور سے اچھی لگتی ہیں چاند کو اپنے پاس بلانا ٹھیک نہیں
صاف دِلوں کو پھر سے میلا کر دیں گی گزری باتوں کو دُہرانا ٹھیک نہیں
رفتہ رفتہ تعبیریں بہہ جاتی ہیں نم آنکھوں میں خواب سجانا ٹھیک نہیں
آؤ میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھو سائل کو خالی لوٹانا ٹھیک نہیں
چھوڑ ضیاء اِن پتھر دِل انسانوں کو
اپنے دِل کا حال سنانا ٹھیک نہیں

OOO

محمد مظہر نیازی

ترے خیال میں کچھ ایسے گم رہا برسوں
میں اپنے آپ سے بھی مِل نہیں سکا برسوں
ترے بغیر مری عمر رائیگاں گزری
کوئی بھی کام نہیں ٹھیک سے ہوا برسوں
کہا تھا تم نے کہ تم لوٹ آؤ گے اِک دِن
سو میں جہاں تھا وہیں پر کھڑا رہا برسوں
کہیں وہ ذائقہ تحلیل ہی نہ ہو جائے
میں اُس سے مِل کے کسی سے نہیں مِلا برسوں
ترے بغیر میں بیساکھیوں سے چلتا رہا
مگر کسی کا سہارا نہیں لیا برسوں
تمہارے ہاتھ کی دستک کی آس میں مظہرؔ!
میں اپنے گھر سے کہیں بھی نہیں گیا برسوں

ooo

نظر ایسی پڑی مجھ پر قلندر ہو گیا ہوں میں
بس اِک نمکین قطرے سے سمندر ہو گیا ہوں میں
نہیں تھا گھر تو میں ہر گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا
ملا ہے جب سے گھر اُس دِن سے بے گھر ہو گیا ہوں میں
میں خود سے جنگ کرتا آ رہا ہوں ایک مُدّت سے
خدا کا شکر اب اپنے برابر ہو گیا ہوں میں
اکیلا تھا تو اکثر تجھ سے بازی ہار جاتا تھا
کبھی اب جنگ مت کرنا کہ لشکر ہو گیا ہوں میں
یہاں میں چاند بننے کی تمنا لے کے آیا تھا
ستارہ بن نہیں پایا تو منظر ہو گیا ہوں میں
لہو کی داستاں لکھنے چلا ہوں ریگِ کربل پر
اکیلا تھا مگر اَب تو بہتّر ہو گیا ہوں میں
اَنا اور خود پرستی سے نکل آیا ہوں اے مظہرؔ!
کسی کی ذات پر جب سے نچھاور ہو گیا ہوں میں

ooo

محمد منصور آفاق

سرد ٹھٹھری ہوئی لپٹی ہوئی صرصر کی طرح
زندگی مجھ سے ملی پچھلے دسمبر کی طرح

کس طرح دیکھنا ممکن تھا کسی اور طرف
میں نے دیکھا ہے تجھے آخری منظر کی طرح

ہاتھ رکھ لمس بھری تیز نظر کے آگے
چیرتی جاتی ہے سینہ مرا خنجر کی طرح

بارشیں اُس کا لب و لہجہ پہن لیتی تھیں
شور کرتی تھی وہ برسات میں جھانجھر کی طرح

کچی مٹی کی مہک اوڑھ کے اِتراتی تھی
میں اُسے دیکھتا رہتا تھا سمندر کی طرح

پلّو گرتا ہوا ساڑھی کا اُٹھا کر منصورؔ!
چلتی ہے چھلکی ہوئی دودھ کی گاگر کی طرح

OOO

چراغ ہو گیا بدنام کچھ زیادہ ہی
کہ جل رہا تھا سرِبام کچھ زیادہ ہی

ترے بھلانے میں میرا قصور اِتنا ہے
کہ پڑ گئے تھے مجھے کام کچھ زیادہ ہی

میں کتنے ہاتھ سے گزرا یہاں تک آتے ہوئے
مجھے کیا گیا نیلام کچھ زیادہ ہی

ملال تیری جدائی کا بے پنہ لیکن
فسردہ ہے یہ مری شام کچھ زیادہ ہی

تمام عمر کی آوارگی بجا لیکن
لگا ہے عشق کا الزام کچھ زیادہ ہی

بس ایک رات سے کیسے تھکن اُترتی ہے
بدن کو چاہیے آرام کچھ زیادہ ہی

سنبھال اپنی بہکتی ہوئی زباں منصورؔ!
تو لے رہا ہے کوئی نام کچھ زیادہ ہی

OOO

محمود عامر

رسم و راہ مجھ سے تھی دِل مگر کسی کا تھا
میں مقیم تھا لیکن اصل گھر کسی کا تھا

پہلے پہلے کیمپس میں کیا حسین دِن گزرے
خوف تھا نہ ان لمحوں ہم کو ڈر کسی کا تھا

کتنا بدلا بدلا تھا اب کی بار وہ چہرہ
جیسے اس پہ میرا نہیں اب اثر کسی کا تھا

میں سمجھ رہا تھا اسے انتظار میرا ہے
نام جو لکھا اس نے ریت پر کسی کا تھا

داؤ پر لگا کر جاں جنگ ہم نے جیتی تھی
نام بعد میں لیکن معتبر کسی کا تھا

نہر کے کنارے پر رات کٹ گئی ساری
اِنتظار اِس دِل کو رات بھر کسی کا تھا

اب تمہارا دِل کب ہے اعتبار کے قابل
اُلفتیں کسی سے تھیں ہم سفر کسی کا تھا

آبیاریاں کرتے عمر کٹ گئی عامؔر
جو درخت پر اُترا وہ ثمر کسی کا تھا

ooo

اشک خود میں اُتارتی کتنے
اور ساون گزارتی کتنے

ہجر کی جنگ میں کمی نہ ہوئی
ہم نے بھیجے سفارتی کتنے

چھوڑ کر آ گئی قبیلے کو
اپنے جذبات مارتی کتنے

اُڑ کے چُھو لیں مجھے ترے گیسو
ہو گئے ہیں شرارتی کتنے

رات دِن بیٹھ کے وہ ساحل پر
ریت کے گھر اُسارتی کتنے

ہم حسینوں کا دِل چُرانے میں
کل تلک تھے مہارتی کتنے

حیثیت دیکھ کر ملیں عامؔر
لوگ بھی ہیں تجارتی کتنے

ooo

مقصودوفا

اے بادِ خوش خرام کوئی مشورہ ہی دے
چلتا رہوں مدام کوئی مشورہ ہی دے
ٹھکرا نہ دوں یہ منزلِ کشف و کمال بھی
آوارگیٔ شام کوئی مشورہ ہی دے
میں مانتا نہیں ہوں کوئی مشورہ مگر
پھر بھی برائے نام کوئی مشورہ ہی دے
توبہ کروں کہ سیرِ خرابات کو چلوں
یا شیخ ، یا اِمام کوئی مشورہ ہی دے
میں کیا کروں کہ اب مرے لیل ونہار میں
ہوتی نہیں ہے شام کوئی مشورہ ہی دے
ہجرت نصیب لوگ ٹھکانہ کہاں کریں
اے صاحبِ مقام کوئی مشورہ ہی دے

OOO

جو چاہتا ہوں صرفِ نظر کر رہا ہوں میں
یہ کام تو نہیں ہے مگر کر رہا ہوں میں
یہ زندگی تو مجھ سے گزاری نہ جا سکی
اِک خواب ہے کہ جس کو بسر کر رہا ہوں میں
کھلنے لگی ہے اُس کی طبیعت ذرا ذرا
اس پر شراب جیسا اثر کر رہا ہوں میں
خورشیدِ بے پناہ کی ناکامیوں کے بعد
چھوٹے سے اِک دِیے سے سحر کر رہا ہوں میں
جب یوں سمٹ سمٹ کے مری سانس گھٹ گئی
تجھ پہ اے ریگِ وقت بکھر کر رہا ہوں میں
دیوار و در پہ رینگتی خبروں کے باوجود
کوئی خبر نہیں ہے خبر کر رہا ہوں میں

OOO

اس غم کو اختیار نہیں کر رہا ہوں میں
یہ تو نہیں کہ پیار نہیں کر رہا ہوں میں
اپنی اُداسیوں کے نشے میں ہوں آج کل
شغلِ خم و خمار نہیں کر رہا ہوں میں
کچھ دیر سے ہے رنگِ تماشا رُکا ہوا
اِک تیر دِل کے پار نہیں کر رہا ہوں میں

اب دیکھتا ہوں راہ میں دُنیا سجی ہوئی
اب تیرا اِنتظار نہیں کر رہا ہوں میں

میں آپ اپنا درد بٹاتا ہوں رات بھر
کچھ تم پہ انحصار نہیں کر رہا ہوں میں

لے رکھ تو اپنا حرفِ تسلی بھی پاس رکھ
یہ کوئی کاروبار نہیں کر رہا ہوں میں

میں زیست کر رہا ہوں یہ تم کو خبر نہیں
تم پر تو جاں نثار نہیں کر رہا ہوں میں

ہے دشت یہ بھی حدِ تصور میں اس لیے
اس دشت کو بھی پار نہیں کر رہا ہوں میں

کیا راز ہے کہ جس کو بتانے سے پیشتر
اپنا بھی اعتبار نہیں کر رہا ہوں میں

یوں تو رہے ہو تم بھی صفِ دُشمناں میں دوست
لیکن تمھیں شمار نہیں کر رہا ہوں میں

ooo

دِل کو بہلاتا ہوں اور تیز ہوا مانگتا ہوں
بعض اوقات میں خود سے بھی پنہ مانگتا ہوں

کفر کرتا ہوں تو کرتا ہی چلا جاتا ہوں
توبہ کرتا ہوں تو رو رو کے دُعا مانگتا ہوں

ہاتھ اُٹھا لیتا ہوں بس عالمِ سرمستی میں
مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ میں کیا مانگتا ہوں

دِین و دُنیا کا یہ معمول نہیں بھایا مجھے
اب کوئی اور صنم اور خدا مانگتا ہوں

ooo

نازفاطمہ

شیشۂ ذات کی طرح ہوں میں ان کہی بات کی طرح ہوں میں
میرا چہرہ رہے مرا عکاس اپنے جذبات کی طرح ہوں میں
جس سے مِل کر مِلا نہیں جاتا اس ملاقات کی طرح ہوں میں
سہمی سہمی ہے ہر خوشی دِل کی سخت حالات کی طرح ہوں میں
جس کا ہونا فقط اُسی تک تھا ایسی برسات کی طرح ہوں میں
میرا ہمدم ہے میرا سناٹا چاندنی رات کی طرح ہوں میں
جس کو آندھی اُڑائے پھرتی ہے
ہاں اُسی پات کی طرح ہوں میں

ooo

اور ہوں یا کہ وہی ہوں شاید آج ہی خود سے ملی ہوں شاید
یاد آتی ہیں پرانی راہیں میں اُدھر لوٹ رہی ہوں شاید
اب کے ساون جو نہیں آنکھوں میں میں تجھے بھول گئی ہوں شاید
مسئلہ کیا ہے اکیلے پن کا تیری چاہت سے تہی ہوں شاید
سامنے کتنی ہی دُنیائیں ہیں نیند سے جاگ اُٹھی ہوں شاید
پھول ہی پھول کھلے ہیں ہر سُو تیری خوشبو میں بسی ہوں شاید
نازؔ سے دیکھ رہا ہے گلشن
تیرے کالر پہ سجی ہوں شاید

ooo

نصرت صدیقی

اپنے حالات کے دھاگوں سے بنی ہے میں نے
آج ایک تازہ غزل اور کہی ہے میں نے

کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کر لوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

چھوٹے لوگوں کو بڑا کہنا پڑا ہے اکثر
ایک تکلیف کئی بار سہی ہے میں نے

زندگی نے مجھے سینے سے لگا رکھا ہے
جان جس دِن سے ہتھیلی پہ دھری ہے میں نے

میں تو جیسا بھی ہوں سب لوگ مجھے جانتے ہیں
تیرے بارے میں بھی اِک بات سنی ہے میں نے

میرے شعروں میں دھڑکتا ہے میرے عہد کا دِل
شاعری کی ہے کہ تاریخ لکھی ہے میں نے

اپنے عیبوں کو عیاں کر کے خجل ہوں لیکن
یہ جسارت بھی اگر کی ہے تو کی ہے میں نے

روزمرہ میں کہے جتنے بھی اشعار کہے
شاعری میں بھی کٹھن راہ چنی ہے میں نے

ایک سے دوسرا اِنسان جدا ہے نصرت
ہر جبیں پر نئی تحریر پڑھی ہے میں نے

ooo

پھولوں سے ہوتی ہوتی رُخِ یار تک گئی
ہر شخص کی نظر مرے معیار تک گئی

یوسف نہیں تھا پھر بھی کئی بار میں بکا
اُس کی گلی بھی مصر کے بازار تک گئی

یہ فیصلہ تو وقت ہی کر پائے گا کبھی
کس کس کی فکر جرأتِ اظہار تک گئی

جب بھی غزل کا مجھ سے کوئی شعر ہو گیا
احباب کی نظر میرے کردار تک گئی

غیرت کا سودا کر گئے فاقوں سے مرتے لوگ
فکرِ معاش جبہ و دستار تک گئی

شدت سے یاد آئی ہے ماں باپ کی مجھے
سایوں کی بات جب گھنے اشجار تک گئی

نصرتؔ کہاں سے آ گئیں لہجوں میں تلخیاں
صوت و صدا کی کاٹ بھی تلوار تک گئی

ooo

نوید سروش

ختم ہے اب سفر خبر کر دو　　　　تھم چکی چشمِ تر خبر کر دو
مت پھرو جستجو میں سائے کی　　　　کٹ چکے ہیں شجر خبر کر دو
ہیں سلامت ابھی پئے پرواز　　　　کچھ مرے بال و پر خبر کر دو
تم زباں سے جو کہہ نہیں سکتے　　　　لکھ کے دیوار پر خبر کر دو
زخم خوردہ ہوئے حسیں چہرے　　　　ہم بھی ہیں دربدر خبر کردو
پھر مسافر بھٹک نہ جائے کہیں
آ گیا اپنا گھر خبر کر دو

○○○

یادیں ، بادل اور برسات　　　　آنکھیں ، کاجل اور برسات
لیلیٰ لیلیٰ کی آواز　　　　صحرا پاگل اور برسات
خامشی ، رستا اور راہی　　　　جگنی ، راول اور برسات
راتیں ، حرکت کرتے سائے　　　　بھیگا آنچل اور برسات
بھیگی بھیگی ساون رُت میں　　　　گاتی کوئل اور برسات
بڑھیا ، بچے کل کی باتیں　　　　چرخا پیپل اور برسات
اس عالم میں چلنا مشکل　　　　لڑکی ، جنگل اور برسات
جھوٹے وعدے ، ہر پل غم　　　　تنہا بے کل اور برسات
اُس کے جانے کا لمحہ
سانسیں ہلچل اور برسات

○○○